چودہواں باب

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

(انتقام)

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۷)

بغض و نفرت کے بعض جذبات کبھی کبھی ابھر کر ان کی زبان تک آجاتے ہیں لیکن وہ حسد و انتقام کی اس آگ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو ان کے سینوں میں دبی ہوئی ہے۔

ایران کا شکست خوردہ گورنر، ہرمزان، جب پا بجولاں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اُس وقت ان دونوں میں جو مکالمہ ہوا تھا، اسے ایک بار پھر سامنے لائیے[1]۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا تھا کہ ہرمزان! یہ کیا بات ہے کہ اس سے پہلے عربوں نے جب بھی تم لوگوں کے سامنے آنے کی جرأت کی، تم نے انہیں نہایت آسانی سے پسپا کر دیا لیکن اب حالت یہ ہے کہ وہی عرب تمہاری پوری کی پوری مملکت کو فتح کئے جا رہے ہیں اور تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم پا بجولاں میرے سامنے ہو اور تمہارا شاہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔

ہرمزان نے جواب میں کہا تھا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اس سے پہلے جب جنگ ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف عرب۔ ایرانیوں کے لئے تنہا عربوں کو شکست دے دینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن اب جو جنگ ہوتی ہے تو اس میں ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا — ہمارے لئے ان دو قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم شکست کھا جاتے

---

[1] دیکھئے چھٹا باب۔

ہیں۔

کیسی عمیق حقیقت تھی جسے ہرمزان دو لفظوں میں بیان کر گیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی دیدوری

مسلمانوں کی قوت کا راز

کی داد دینی پڑتی ہے، جن کی نگاہیں، اسلام کی اس منفرد اور بسیط حقیقت تک ایسے صاف اور شفاف انداز سے پہنچ گئیں اور اس طرح انہوں نے جماعتِ مومنین کی بے پناہ قوت کا راز پالیا۔ ہرمزان نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کی ترجمانی تھی جن میں کہا گیا ہے کہ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۸/۱۹) "خدا مومنین کے ساتھ ہے۔" اور وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۳۰/۴۷) "مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے"۔ ایرانی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مومنین کے ساتھ ہے، ہم (یا دنیا کی کوئی طاقت) ان پر غالب نہیں آسکتی۔ لہٰذا، ان سے اپنی شکستوں کا انتقام کے لئے ضروری ہے کہ ان سے ان کے خدا کا ساتھ چھڑا دیا جائے۔

اور اس کے بعد، ہماری ساری تاریخ اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارا خدا کس طرح چھڑایا گیا۔
ظاہر ہے کہ خدا مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے، بہ نفسِ نفیس، زمین پر نہیں آجاتا تھا۔ "خدا کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے میں مسلمان خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ان کے دین کا تمکن، اور خدا کے اس وعدے کا عملی ثبوت تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ

ان سے قرآن چھڑا دو

عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (۴/۱۴۱) "خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں ہونے دے گا"۔ ان کے ہاتھوں شکست خوردہ قوموں کی سازش یہ تھی کہ ان سے خدا کی کتاب (قرآن کریم) کو الگ کر دیا جائے۔ اسی کو اقبالؒ "عجمی سازش" کہہ کر پکارتا ہے۔ واضح رہے کہ جب اقبالؒ، عربی اسلام کے مقابلہ میں عجمی اسلام کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد عرب اور ایران کے دو ملک نہیں ہوتے۔ عربی اسلام سے اس کی مراد ہوتی ہے وہ اسلام جسے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے عالمِ انسانیت کو عطا فرمایا اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور عجمی اسلام سے مراد مروجہ اسلام ہے جس میں تحریف ہو چکی ہے۔ وہ اوّل الذکر کو عربی اس لئے کہتا ہے کہ اس کی اوّلین مخاطب قوم عرب تھی اور وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا اور ثانی الذکر کو عجمی اس لئے کہ اس کی تحریف کی ابتدا بھی ایران سے ہوئی تھی اور جن غیر قرآنی نظریات، تصورات اور معتقدات

سے یہ اب مرکب ہے، ان کا معتدبہ حصہ بھی قدیم ایرانی (مجوسی) مذہب اور تمدن پر مشتمل ہے۔

صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے ایرانؔ اور رومؔا دونوں سلطنتوں کو پاش پاش کیا تھا لیکن ان میں ایک بنیادی فرق تھا۔ رومؔا کی سلطنت کے صرف بعض حصے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے۔

ایرانؔ اور رومؔا کی فتوحات میں فرق

نہ ان کی پوری کی پوری مملکت کا خاتمہ ہو گیا تھا، نہ ان کی تہذیب مٹی تھی۔ اس کے برعکس، ایران کی مملکت بھی ختم ہو گئی تھی اور ان کی وہ ہزار ہا سالہ تہذیب بھی، جس پر انہیں اس قدر فخر و ناز تھا، مٹ گئی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کی اس فتح کا زخم، ایرانیوں کے دل پر بڑا گہرا تھا اور اسی لئے وہ، مسلمانوں، (بلکہ اسلام) کے خلاف انتقام جوئی میں پیش پیش تھے۔ باقی اقوام، یہودی، نصاریٰ، تبعاً ان کا ساتھ دیتے تھے۔ کوشش ان سب کی یہی تھی کہ مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہو جائے ــــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور پوری طرح کامیاب ہوئے۔

ایرانؔ اور رومؔا میں ایک فرق اور بھی تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مسلمانوں نے ان کے ممالک فتح کئے تھے لیکن وہاں کی آبادی کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ــــ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا کیونکہ ایسا کرنا قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف تھا۔ سلطنتِ رومؔا کے مفتوح علاقوں کے باشندے (عیسائی) عام طور پر اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن ایران کے باشندے بالعموم مسلمان ہو گئے۔ ان میں سے اکثر جیوشِ اسلامیہ کے حملوں کے وقت، ساتھ کے ساتھ مسلمان ہوتے گئے۔ ان اسلام لانے والوں میں، ایرانی عوام ہی نہیں تھے، ان کے اربابِ دانش و بینش اور اعیانِ دساتیر و ضوابط بھی تھے۔ مثلاً شاہنشاہ یزدگردؔ نے دیلمؔ کی قوم سے ایک منتخب دستہ تیار کیا تھا جس کی تعداد چار ہزار تھی۔ یہ "جُندِ شاہنشاہ" یا بادشاہ کا لشکرِ خاص کہلاتا تھا۔ فتح قادسیہ کے بعد یہ لشکر ایرانیوں سے الگ ہو کر، اسلام لے آیا۔ اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی اجازت سے کوفہ میں آباد ہو گیا۔ اسی طرح، یزدگردؔ کی فوجِ ہراول کا سردار، ایک جلیل القدر افسر تھا جو سیاہؔ کے لقب سے مشہور تھا۔ یزدگردؔ جب اصفہان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے سیاہؔ کو ایک منتخب لشکر کے ساتھ اسلامی افواج کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا لیکن وہ مقابلہ کرنے کے بجائے، اپنے لشکر سمیت مسلمان ہو گیا۔ یہ سب بصرہ میں آباد ہو گئے۔ باذانؔ، نوشیرواں کی طرف سے یمنؔ کا گورنر

ایرانی اسلام لے آئے

تھا۔ اس کی رکاب میں جس قدر فوج تھی اس میں سے بھی بیشتر مسلمان ہو گئے تھے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ شاہنشاہ یزدگرد کا ذاتی لشکر بھی مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ لوگ صرف فوجی سپاہی نہیں تھے بلکہ اکبر کے نورتنوں کی طرح، شاہنشاہ کے مشیرِ خاص تھے اور **اساورہ** کہلاتے تھے۔ ایران میں شاہنشاہ کے تقرب اور عزت و عظمت کا سب سے بڑا نشان، سونے کا کنگن ہوتا تھا۔ جنہیں یہ نشان

اساورہ

مرحمت ہو جاتا وہ اہلِ اساورہ کہلاتے تھے۔ (اسورہ کنگن کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اہلِ جنت کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ " اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ " (سونے کے کنگن پہنے ہوں گے (۲۱/۱۸) تو اس سے مراد بلند مدارج و مراتب ہے) فتوحات کے بعد، یہ لوگ فوج در فوج اور جوق در جوق اسلام لاتے چلے گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے (نہ کہنا چاہتے ہیں) کہ یہ سب (اسلام لانے والے) دل میں کوئی کھوٹ لے کر مسلمان ہوئے تھے لیکن (جیسا کہ آگے چل کر نظر آجائے گا) ان کے اربابِ فکر و نظر کا بیشتر حصہ اسی مقصد کے لئے زمرۂ امّتِ مسلمہ میں داخل ہوا تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں میں اپنے قدیم مجوسی نظریات و معتقدات آسانی سے پھیلا سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ (اس زمانے کی) عربوں جیسی سادہ ذہنیت کی حامل قوم، ایرانی فکر کی پیچیدگیوں اور ان کی عیارانہ سیاست کی دسیسہ کاریوں کی حریف ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے وہ اس میدان میں، ان سے نہایت آسانی سے مات کھا گئے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) لیکن ان میں سے جو لوگ نیک نیتی سے بھی مسلمان ہوئے تھے، ان کا اسلام لانا ایسا ہی تھا جیسا ان بدوی قبائل کا اسلام لانا جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ تمہیں یہ کہنا چاہیئے کہ تم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے باخبر تھے۔ چنانچہ ان کے پیشِ نظر یہ پروگرام تھا کہ ان نو مسلموں کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے، ہرمزان کی سازش کارگر ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، (حضرت) عمرؓ کا

وجود ہے۔ جب تک اسے راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ وہ رکاوٹ دور ہوگئی تو اگلا راستہ صاف اور آسان ہوگیا۔ نومسلم عوام کی تعلیم و تربیت بھی نہ ہوسکی اور ان کے عیّار طبقہ کے لئے مسلمانوں میں اپنے خیالات پھیلانے کیلئے فضا بھی ساز گار ہوگئی۔

اس مقصد کے لئے، عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ سامنے آتے ہیں۔ ایک محاذ کا مقصد اسلامی سلطنت کو کمزور کرکے اپنا سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا اور دوسرے کا منتہیٰ اسلام کو کسی نہ کسی طرح عجمی تصورات، نظریات و معتقدات کے رنگ میں رنگ (بلکہ ڈبو) دینا بلکہ (اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو) سیاسی غلبہ بھی ان کے لئے مقصود بالذّات نہیں تھا۔ وہ بھی اس دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا جو کچھ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا، وہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

(•)

نازک مقام

لیکن یہ وہ وادی ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے "فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔" اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے مروّجہ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس عجمی سازش کا شکار اور غیر اسلامی تصورات سے ملوّث نہ ہوچکا ہو ــــ یہ اسلام، اربابِ شریعت کا ہو، یا اصحابِ طریقت کا، اور اربابِ شریعت میں سے بھی کسی فرقہ یا مسلک کا ہو، اس پر عجمی (غیر قرآنی) تصورات کا ٹھپہ ضرور لگا ہوا ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ جب مروّجہ اسلام کے متعلق کہا جائے کہ یہ غیر اسلامی معتقدات و نظریات سے ملوّث ہے، تو یہ بات ہمارے مذہب پرست طبقہ پر یقیناً گراں گزرے گی۔ اس لئے کہ وہ اس پر مصر ہوتے ہیں کہ جس اسلام کے وہ پیرو ہیں، وہی حقیقی اسلام ہے۔ بظاہر یہ بات ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز سی نظر آتی ہے کہ اگر کسی مروّجہ عقیدہ یا مسلک کے متعلق بتادیا جائے کہ وہ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے تو یہ حضرات اس پر کیسے مُصر ہوسکتے ہیں کہ حقیقی اسلام وہی ہے جس پر وہ کاربند ہیں لیکن یہ چیز کتنی ہی ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز کیوں نہ ہو، ہے یہ حقیقت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں سند اور حجت، روایات اور تاریخ ہیں اور قرآن کا وہی مفہوم قابلِ قبول ہوسکتا ہے جس کی تائید روایات اور تاریخ سے ہوتی ہو۔ یعنی یہ حضرات، بجائے اس کے کہ روایات اور تاریخ کو

کتبِ روایات و تاریخ

قرآن کے تابع رکھیں، قرآن کو روایات اور تاریخ کے تابع رکھتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی ذرا آگے چل کر ملیگی)، اور یہ

معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ روایات کے مجموعے ہوں یا کتبِ تاریخ، یہ سب ایرانیوں کی مرتب کردہ ہیں۔ سنّیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں صحاحِ ستّہ، یعنی صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات کی احادیث کی چار کتابیں ایسی ہیں۔ یہ مجموعے سنّیوں کے ہوں یا شیعوں کے، ان کے جمع اور مرتب کرنے والے سب ایرانی تھے۔ اسی طرح تاریخ کی سب سے پہلی اور قابلِ اعتماد تصنیف امام طبری کی ہے۔ وہ بھی ایرانی تھے۔ (تفسیر کی سب سے پہلی کتاب بھی انہی کی ہے) اور یہ سب کتابیں بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے زبانی روایات کی بنا پر تیسری چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئیں۔ صدرِ اوّل کے اتنے عرصے بعد، اس طرح مرتب شدہ کتبِ روایات و تاریخ جس قدر قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں، ظاہر ہے۔ جہاں تک شیعہ حضرات کی کتبِ روایات اور تاریخ کا تعلق ہے، ان کے سلسلہ میں ایک دشواری اور بھی لاحق ہوتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں تقیّہ، دین کے مسلّمات (بلکہ اساسات) میں سے ہے۔ تقیّہ کیا ہے؟ اور دین میں اس کا مقام کیا، اسے ہم، ان حضرات کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب، اصولِ کافی[1] سے بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے بابِ تقیّہ میں لکھا ہے:۔

تقیہ

(۱) فرمایا حضرت ابوجعفر علیہ السلام نے کہ مخالفین سے بظاہر میل ملاپ رکھو اور باطن میں مخالفت رکھو۔

(۲) حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے امرِ امامت کو اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے، بلکہ چاہیئے یہ کہ نااہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں۔ ہمارے دوستوں سے ہمارا سلام کہو اور کہو کہ رحم کرے اللہ اس بندہ پر جو بحالتِ تقیّہ ہمارے مخالفوں سے اپنی دوستی ظاہر کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اے سلیمان! تم اس دین پر ہو کہ جس نے چھپایا، خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا اللہ نے اسے ذلیل کیا۔

یہ ہے تقیّہ اور اس کا مقام یہ ہے کہ:۔

فرمایا حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہ اے معلّیٰ! تقیّہ میرا اور میرے آبا کا دین ہے۔ جس کے لئے

---

[1] اصولِ کافی اور فروعِ کافی اور ان کے تراجم کا تعارف ذرا آگے چل کر کرایا جائے گا۔

تقیہ نہیں اس کے لئے دین نہیں۔ (اردو ترجمہ سید ظفر حسن صاحب قبلہ، جلد دوم صہ ۲۴۷۔ ۲۴۰)

اسی کے مطابق ان ائمہ کرامؑ کا عمل بھی تھا۔ کافی میں ہے:۔

میں نے ابو عبداللہ علیہ السلام کو فرماتے سنا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ ہم نہیں کہتے مگر حق، تو اس کو چاہیئے کہ وہ اکتفا کرے اس پر جو ہم سے جانا ہے اور اگر ہم سے کوئی بات ایسی سنی جو حکم خدا کے خلاف ہو تو سمجھ لے کہ ہم نے تم سے دشمنوں کے ضرر کا دفیعہ چاہا ہے، یعنی بصورتِ تقیہ اس کو بیان کیا ہے۔ (الشافی۔ جلد اوّل، صہ ۷۳۔ ۷۲)

ایک اور روایت میں ہے:۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک شیعہ سے فرمایا کہ اگر میں تم سے اس سال ایک حدیث بیان کروں اور دوسرے سال جب آؤ تو اس کے خلاف بیان کروں تو تم کس پر عمل کرو گے۔ میں نے کہا۔ آخر والی پر، امام نے فرمایا۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔ (یعنی پہلی روایت بنا پر تقیہ تھی)، (ایضاً صہ ۷۳)

ظاہر ہے کہ ان حضرات کی مرتب کردہ کتبِ احادیث و تاریخ سے اصل حقیقت کا معلوم کرنا، ناممکنات میں سے ہے۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی (سُنی اور شیعہ حضرات کی) کتبِ روایات و تاریخ کی جمع و تدوین کی حقیقت لیکن انہیں مقدس ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا، کفر قرار دے دیا جاتا ہے۔ ان کی تقدیس کے

ایک واقعہ ــــ حضرت عائشہؓ کی عُمر

سلسلہ میں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ امر بطور مسلّمہ مانا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال کی تھی۔ یہ بات ایک طرف قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہے جس کی رُو سے بلوغت، نکاح کی شرط ہے۔ دوسری طرف، اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف جس قسم کا اعتراض وارد ہوتا ہے، اس پر مستشرقین کی تصنیفات شاہد ہیں۔ راقم الحروف نے ایک مدت کے تجسس و کاوش کے بعد، بالتحقیق ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ اس پر ان حضرات کو سجدۂ شکرانہ ادا کرنا چاہیئے تھا کہ غلط روایات نے دامنِ رسالتمآبؐ پر جو داغ لگایا تھا اور جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو دریدہ دہنی کا موقعہ مل جاتا تھا، اس تحقیق سے وہ داغ دھل گیا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ردِّ عمل کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس

سے بخاری شریف کی روایت کو غلط تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو کفر ہے۔ لہٰذا یہ شخص منکرِ حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ چنانچہ میرے خلاف ایک ہزار "علمائے کرام" نے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

یہ ہے ان کتابوں کی تقدیس کا عالم — اور ظاہر ہے کہ یہ خود اسی عجمی سازش کا ایک حصّہ ہے اور اسے کامیاب بنانے اور ابدیت عطا کرنے کا نہایت محکم ذریعہ۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ جب ہم ان تاریخی بیانات اور روایات کو وضعی قرار دیں گے جن پر ہمارے مروّجہ اسلام کے خلافِ قرآن نظریات و معتقدات کی بنیاد ہے تو ہمارا قدامت پرست طبقہ اس سے کیسے متفق ہو سکے گا؟ روایات اور تاریخ کے باب میں میرا جو مسلک ہے، اسے میں (اس کتاب کے) مقدّمہ میں وضاحت سے بیان کر چکا ہوں۔ مختصراً وہ مسلک یہ ہے:-

میرا مسلک

(۱) دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب، قرآن مجید ہے، جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ ہماری کتبِ روایات و تفسیر میں جو باتیں، قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں، انہیں صحیح سمجھنا چاہیئے اور جو اس کے خلاف ہیں، انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔

(۲) حضور نبئ اکرمؐ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے اور جملہ صحابہ کبارؓ کے مومن حقّاً ہونے پر قرآن کی شہادت۔ اس لئے کتبِ روایات اور تاریخ میں جو باتیں ایسی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرتِ مقدّسہ داغدار ہوتی ہو، یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، انہیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ ہے میرا مسلک۔ باقی رہے دورِ صحابہؓ کے بعد کے وہ بزرگ جنہیں واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے، (خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے بتایا جائے) جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، اگر ان میں کوئی بات ایسی ہے جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہے، تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس بات کی نسبت غلط ہے۔ اگر وہ دین کے بزرگ تھے تو وہ ایسی بات کہہ یا کر نہیں سکتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص، اس کے باوجود، اس پر اصرار کرتا ہے کہ اس کی نسبت ان کی طرف بالکل صحیح ہے تو پھر خدا کا یہ ارشاد میرے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں دنیا سے گزر گئے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ انہوں نے کیا، اس کے ذمّہ دار وہ ہیں، جو کچھ تم کرو گے، اس کے ذمّہ دار تم ہوگے۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲/۱۴۱) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا ان میں جتنی باتیں ایسی ہیں جو قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہیں، ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ صحابہ کبارؓ یا بزرگانِ عظام کی طرف ان کی نسبت، غلط ہے۔ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنّی، نہ اہلِ فقہ ہوں نہ اہلِ حدیث۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ قرآن کو خدا کی آخری، مکمّل اور غیر متبدّل کتاب مانتا ہوں اور حضورؐ ختمی مرتبت کو خدا کا آخری رسول۔ جس پر نبوّت ختم ہوگئی۔ میں تاریخ اور روایات کا جائزہ قرآنِ کریم کی روشنی میں لیتا ہوں۔ جو کچھ میں نے آئندہ صفحات میں لکھا ہے، اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عجمی سازش نے کس چابکدستی سے قرآن کا دامن اُمّت کے ہاتھوں سے چھڑا کر، اسلام کو کیا سے کیا بنا دیا۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے، تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بات کسی کو ناگوار گزرے، تو (اگرچہ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں، تاریخ اور روایات پر ہوگی، بایں ہمہ) میں، ان سے معذرت طلب ہوں کہ کسی کی آزردگیٔ خاطر میرا شیوہ نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اُس زمانے کے اہلِ ایران

ایک وضاحت اور بھی ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام میں اس تحریف کا آغاز ایران سے ہوا اور اس میں جس قدر غیر اسلامی نظریات و معتقدات در آئے، وہ ایران کے قدیم مذہب مجوسیت سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم موجودہ اہلِ ایران کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ ان سے مراد اس زمانے کے اہلِ ایران ہیں۔ وہ سب قصّہ ماضی ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر (از روئے تاریخ) ان پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری، ان کے بعد آنے والوں یا موجودہ اہلِ ایران پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں جو کچھ ایران کے متعلق کہا جائے گا، اس سے اُس زمانے کے اہلِ ایران مراد ہوں گے۔ اس وضاحت کو ہر مقام پر پیشِ نظر رکھیے۔

(٥)(٥)

مسئلہ خلافت

وہ پہلی چٹان جس سے ٹکرا کر اُمّت کی کشتی دو ٹکڑے ہوگئی، مسئلہ خلافت ہے۔ پہلے یہ مسئلہ محض سیاسی تھا لیکن بعد میں اس نے مذہبی شکل اختیار کرلی اور اس طرح یہ اُمّتِ واحدہ، دو مستقل مذہبی فرقوں (سنّی اور شیعہ) میں اس طرح بٹ گئی کہ اس خلیج کے پلٹنے کی کوئی شکل ہی نہیں۔ ہم تیسرے باب (متعلقہ خلافت) میں دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ کا

انتخاب اُمت کے باہمی مشورے سے عمل میں آتا ہے لیکن جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا تو حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر اس سے اختلاف کیا کہ وہ رسول اللہ کے ترکہ کے وارث ہیں اور خلافت بھی اسی میں آتی ہے، اس لئے خلافت ان کا حقِ وراثت ہے جسے کوئی اور نہیں لے جا سکتا۔ اپنے اس دعوے کو منوانے کے لئے انہوں نے کچھ عرصہ تک تگ و تاز بھی کی لیکن حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ خلافتِ فاروقیؓ کے زمانے میں بھی اس باب میں خاموشی رہی لیکن حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ پھر نہ بجھ سکی۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے واقعہ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ہم پوری تفصیل میں جانے کے بجائے (بغرضِ اختصار) اس کا اتنا حصہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "جب حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آ گیا تو حضرت علیؓ منہ موڑ کر چل دیئے لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے ٹوکنے پر مڑے اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ — فریب ہے، کتنا بڑا فریب۔" (طبری۔ جلد ۳)۔ نہج البلاغہ (جو حضرت علیؓ کے خطبات اور دیگر ارشاداتِ گرامی پر مشتمل ہے) شیعہ حضرات کے ہاں بڑی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کا ایک مشہور خطبہ، شقشقیہ کے نام سے منقول ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد، ہر سہ خلفاء نے ان کے حقِ خلافت کو، جو انہیں وراثتاً ملتا تھا، غصب کر لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان حالات پر صبر کیا اور "اپنی میراث کو تاراج ہوتے دیکھتا رہا۔"

بطورِ حقِ وراثت

اری تراثی نهبا۔　　(نہج البلاغہ، شائع کردہ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۳ء ایڈیشن، صہ ۲۷۔ ۱۲۶)

لیکن خلافت بطورِ حقِ وراثت کے دعویٰ میں ایک سقم تھا جس کی وجہ سے یہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) بنو عباس نے یہ دعوےٰ کیا کہ وراثت کی بنا پر خلافت ان کا حق ہے، نہ کہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا۔ ان کی پیش کردہ دلیل یہ تھی کہ شریعت کی رو سے، چچا کی موجودگی میں، چچا کے بیٹے کو حقِ وراثت نہیں پہنچتا۔ رسول اللہ کی وفات کے وقت، حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ موجود تھے۔ لہٰذا، حضورؐ کی وراثت کے حق دار وہ تھے، نہ کہ حضورؐ کے چچا کے لڑکے حضرت علیؓ۔ بنو عباس کے اس دعویٰ کی بنا پر یہ بحث خاندانی یا سیاسی بن کر رہ گئی۔ اس نے جو مذہبی شکل اختیار کی اس کی بنیاد دوسری تھی۔ اس بنیاد تک پہنچنے کے لئے کچھ تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

اہلِ ایران کا اپنے بادشاہوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ عام انسان نہیں، بلکہ فوق البشر ہوتے ہیں اور

اہلِ ایران کا اپنے شہنشاہوں کے متعلق عقیدہ

خدائی صفات و اختیارات کے حامل۔ وہ لوگوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی طرف سے حکومت کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے حکومت ان کا اور صرف انہی کا حق ہوتا ہے، اور کوئی شخص ان کا یہ حق چھین نہیں سکتا۔ یہ حق ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کا سایہ اور اس کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی غلطی نہیں کر سکتے، اس لئے لوگوں پر ان کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔ ساسانی شہنشاہوں کے زمانہ میں یہ عقائد شدت اختیار کر چکے تھے کہ اتنے میں قرآن آیا اور اس نے ان تمام عقائد کو باطل قرار دے دیا۔

عہدِ حضرت عثمانؓ میں ایک عجیب و غریب شخصیت تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہے، جو عبداللہ بن سبا

عبداللہ ابنِ سبا

کے نام سے مشہور، اور ابن السوداء کے لقب سے معروف ہے۔ بعض مؤرخین[1] اسے ایک فرضی شخصیت قرار دیتے ہیں لیکن جو اس کی واقعیت کے قائل ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ یمن کا رہنے والا یہودی تھا جو مدینہ میں آکر مسلمان ہوا۔ اس نے کچھ عرصہ وہاں رہ کر رموزِ مملکت سے واقفیت حاصل کی اور اس کے بعد وہاں سے نکل کر کوفہ کو اپنی خفیہ سازشوں کا اوّلین مرکز بنایا۔ بعض تاریخی روایات میں ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے مدائن (ایران) میں بھی رہا تھا۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا اور وہاں سے سازش کا جال ہر طرف پھیلانا شروع کر دیا۔ اس سازش کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت علیؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ چنانچہ ۳۵ھ میں، ایک مسلح لشکر نے جو اہالیانِ مصر، بصرہ اور کوفہ پر مشتمل تھا، مدینہ پہنچ کر، خلیفۃ المسلمین، حضرت عثمانؓ کا گھیراؤ کیا اور آخر الامر انہیں روزِ روشن میں شہید کر ڈالا اور حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ شہادتِ حضرت عثمانؓ کے کے بعد (تاریخ کے بیان کے مطابق) جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے زیرِ قیادت اُمت میں باہمی تصادم ہوا (جسے جنگِ جمل کہا جاتا ہے) تو عبداللہ بن سبا حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا۔ اسی کی وہ جماعت تھی کہ جب انہوں نے فریقین میں صلح کے آثار دیکھے تو حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کر کے جنگ کی آگ بھڑکا

---

[1] مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔ (الفتنۃ الکبریٰ۔ حضرت عثمانؓ)

دی۔ پھر یہی جماعت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان، جنگِ صفین کے موقعہ پر حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہوکر اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہی۔

لیکن یہ عبداللہ بن سبا کا سیاسی کردار ہے۔ اس کی وہ سازش جس نے اسلام کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، اس کے وہ نظریات تھے جن کا پراپیگنڈہ اس نے اس شدومد سے کیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ مجھے مسلمانوں کی اس سادگی پر تعجب آتا ہے کہ یہ اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ

رجعت کا عقیدہ

دنیا میں آئیں گے لیکن رسول اللہ کے دوبارہ دنیا میں آنے کو نہیں مانتے۔ ان کی مراجعت دنیا میں ضرور ہوگی۔ رسول اللہ کے متعلق یہ عقیدہ تو مسلمانوں میں عام نہ ہوسکا لیکن (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) شیعہ حضرات کے ہاں بعض ائمہ کے متعلق یہ عقیدہ پھیل گیا۔ اسے رجعت کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔

(تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے بعد اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہر پیغمبر کا ایک خلیفہ اور وصی ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے وصی، حضرت علیؓ ہیں۔ حضورؐ کی نص (واضح ارشاد) کے مطابق، حضرت علیؓ کو آپؐ کے بعد خلیفہ ہونا چاہیئے تھا۔ جن لوگوں نے انہیں خلیفہ نہیں بننے دیا انہوں نے ان کے حق کو غصب کیا ہے۔ اب مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو معزول یا قتل کر کے حضرت علیؓ کو ان کی جگہ خلیفہ بنائیں اور اس طرح اپنی سابقہ غلطی کی تلافی اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔

ان معتقدات کی اشاعت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں، خلافت کے متعلق اس قسم کے نظریات پھیلنے

امامتِ منصوص کا نتیجہ

شروع ہوگئے جو ایرانی اپنے شہنشاہوں کے متعلق رکھتے تھے۔ ان نظریات کی رُو سے کہا گیا کہ خلافت (جس کی جگہ امامت کی اصطلاح اختیار کی گئی، جو خلافت کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے) ان مصالحِ عامہ میں سے نہیں جنہیں خدا انسانوں کی فکر و نظر کے سپرد کردے اور جو امت کے متعین کر دینے سے متعین ہوجائے۔ یہ دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے۔ رسول کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ اسے یونہی چھوڑ جائے اور امت کے حوالے کر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ امت کے لئے ایک امام مقرر کر جائے۔ چنانچہ وہ، اس کے لئے، خدا کے حکم کے مطابق، وصیت کر کے جاتا ہے۔ رسول اللہ نے امامت کے لئے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت فرمائی تھی۔ اسی جہت سے آپ (حضرت علیؓ) کو وصیِ رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، ہر امام، اپنے بعد ہونے

والے امام کے حق میں وصیت کر کے جاتا ہے، اور چونکہ یہ وصیت، خدا کے حکم کے مطابق ہوتی ہے، اس لئے امام، منصوص یا مامور من اللہ ہوتا ہے (یعنی خدا کی طرف سے مقرر کردہ امام)۔ وہ ہر غلطی سے منزہ اور ہر خطا سے پاک ہوتا ہے، اس لئے اسے امام معصوم کہا جاتا ہے۔ لہذا، امام منصوص کے علاوہ، کسی اور کا جانشینِ رسول اللہ بن بیٹھنا غصبِ امامت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ یہ امامت صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق ہے۔

کفر و ایمان کا خطِ امتیاز

ظاہر ہے کہ خلافت کے متعلق یہ عقیدہ، سنیوں کے عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہے۔ اس سے امت میں (پہلی مرتبہ) دو ایسے فرقے وجود میں آ گئے جن میں مستقل نزاع پیدا ہو گئی۔ اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت، اصولِ ایمان میں سے قرار دے دی گئی۔ اس لئے یہ نقطہ، کفر اور ایمان میں حدِ فاصل بن گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے، شیعہ اور سنی مسلمانوں کے دو فرقے قرار نہیں پاتے، بلکہ (شیعہ حضرات کے عقیدہ کی رو سے) غیر شیعہ (جو امام منصوص کے قائل نہیں)، دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے شیعہ حضرات کے نزدیک سنی، مسلمان ہی قرار نہیں پا سکتے۔ پھر جس طرح، آگے چل کر، سنیوں میں متعدد فرقے پیدا ہو گئے، اسی طرح شیعہ بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے، اس پر ان کے سب فرقے متفق ہیں (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ شیعہ حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ عقائد اُس علم پر مبنی ہیں جو ان کے ائمہ کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا)۔

ایرانی نظریہ

(تاریخی روایات کی رُو سے،) جن خیالات کی تخم ریزی عبد اللہ بن سبا نے کی تھی وہ ان شکلوں میں برگ و بار لائے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ شخص یمن کا رہنے والا تھا لیکن چونکہ یمن اس زمانے میں ایرانیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا، اور وہاں ایرانی بکثرت آباد تھے، اس لئے ابن سبا کے ان خیالات کا سرچشمہ ایرانیوں کے معتقدات ہی تھے۔ وہ اس کے بعد زیادہ عرصہ کوفہ اور بصرہ میں رہا جہاں ایرانیوں نے (اسلام لانے کے بعد) سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ نیز، وہ مدائن میں بھی رہا، جو ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ان قرائن کی رُو سے قیاس کا رُخ اسی طرف جاتا ہے کہ اس کے یہ خیالات ایرانی معتقدات ہی کا عکس تھے۔ ہیکل نے اس باب میں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شائع کردہ "تاریخ المورخ" کا ایک طویل اقتباس، اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایرانیوں نے اسلام اختیار کیا

تو اس کا اثر سیاسی اور مذہبی گوشوں پر بڑا گہرا پڑا۔ اس میں لکھا ہے۔

ایرانی عقیدہ، ملک کے بادشاہ کو " خدا کا بیٹا " قرار دیتا تھا اور اسے پیدائشی طور پر عظمت و تقدس کا دیوتا سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمدؐ کے عم زاد بھائی اور شرعی وارث حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو گئے جنہیں خلافت سے دُور رکھا گیا تھا[1] اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ہالہ قائم کر دیا گیا جو اُن کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ پھر جس طرح ان کے بزرگ کسریٰ کو آسمان کا بیٹا، مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقّب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اُسے " سید و مرشد " لکھا جاتا تھا، اسی طرح انہوں نے، اپنے اسلام کے زمانے میں حضرت علیؓ کو امام کا لقب دے دیا جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے۔

جب حضرت علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے گرد۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اکاسرہ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج سے، امامت، مقدس حق کے ساتھ رشتہ بدامن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنوامیہ سے حکومت چھین کر، رسول اللہ کے قرابت داروں، بنو عباس، کو تخت پر بٹھا دیا، ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصولِ امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جس تاج کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دی تھیں۔ (عمر فاروقؓ اعظم، از محمد حسنین ہیکل، اردو ترجمہ صفحہ ۴۱۹)

یزدگرد کی بیٹی کی امام حسینؓ کے ساتھ شادی کا ذکر چھٹے باب میں آ چکا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حضرات کی احادیث کی کتاب، اصول الکافی میں جو روایت آئی ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ اس میں ذکرِ مولدِ علی

حضرت شہر بانو کے متعلق شیعہ روایت

---

[1] اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔

بن الحسینؑ کے ضمن میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ کا نام سلآمہ (زیادہ مشہور شہر بانو ہے ممکن ہے یہ نام اسلامی ہو) بنتِ یزد جرد بن شہریار بن شیرویہ بن کسریٰ تھا۔ اور یزد جرد ایران کا آخری بادشاہ تھا۔" اس کے بعد ہے،

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بنتِ یزدجرد حضرت عمرؓ کے پاس آئیں تو مدینہ کی باکرہ لڑکیاں ان کا حسن وجمال دیکھنے بالائے بام آئیں۔ جب مسجد میں داخل ہوئیں تو چہرہ کی تابندگی سے مسجد روشن ہو گئی۔ عمرؓ نے جب ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ چھپالیا اور کہا۔ بُرا ہو ہرمز کا کہ اس کی سوئے تدبیر سے یہ روزِ بدنصیب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ کیا تو مجھے گالی دیتی ہے (کہ میرے دیکھنے کو روزِ بد کہا) اور ان کی اذیّت کا ارادہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔ امیرالمومنین نے کہا کہ اس کو اختیار دو کہ یہ مسلمانوں میں سے کسی کو اپنے لئے اختیار کرلے۔ اس کے حصّۂ غنیمت میں اس کو سمجھ لیا جائے۔ جب اختیار دیا گیا تو وہ لوگوں کو دیکھتی ہوئی چلیں۔ (اور امام حسینؑ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا) امیرالمومنین نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے۔ کہا جہاں شاہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں بلکہ شہر بانو۔ پھر امام حسین سے فرمایا، اے ابو عبداللہ! تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے پیدا ہوگا جو اہلِ زمین میں سب سے بہتر ہوگا۔ چنانچہ علی ابن الحسین پیدا ہوئے۔ پس وہ بہترین عرب ہاشمی ہونے کی وجہ سے اور بہترین عجم تھے ایرانی ہونے کی وجہ سے۔

(کتاب الشافی، جلد اوّل، صہ ۹۔ ۵۷۸۔ ترجمہ اصول کافی، جلد اوّل)

حضرت علیؑ کے ساتھ اہلِ ایران کے سلسلۂ روابط کی ایک کڑی (تاریخی روایات کی رُو سے) ایک اور شخصیّت بھی ہیں۔ یعنی حضرت سلمان فارسیؓ جو معروف صحابی ہیں۔ اُن کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مورّخ ابنِ

حضرت سلمانؓ فارسی

اثیر نے (اپنی کتاب، اسد الغابہ فی سیرۃ الصحابہؓ) میں لکھا ہے کہ حضرت سلمانؓ، اصحابِ رسول اللہ میں سے تھے۔ ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈھائی سو برس سے لے کر چھ سو برس تک بیان کی جاتی ہے۔ انہوں نے حواریانِ حضرت مسیحؑ کا زمانہ پایا تھا اور ان کی صحبت میں رہے تھے۔ انہیں حضرت مسیحؑ کی پیشگوئی دربارۂ بعثتِ احمدؐ (فارقلیط) کا علم تھا، اور یہ بھی کہ آپؐ کا ظہور یثرب میں ہوگا۔ انہیں ایک یہودی نے جو مالِ تجارت لیکر یثرب کی طرف آرہا تھا، پکڑ کر غلام بنالیا اور اس طرح یہ اس کے ساتھ وہاں آگئے۔ ہجرت کے بعد، یہ مدینہ آکر حضورؐ کے دستِ مبارک پر مشرّف بہ اسلام ہوئے اور آپؐ نے انہیں صحابہؓ کی مالی مدد سے،

یہودی کی غلامی سے نجات دلائی۔ جب آپؐ نے مدینہ میں مہاجرین اور انصار میں مواخات قائم کی تو (حضرت) سلمانؓ کا ان دونوں میں سے کسی میں بھی شمار نہ ہوا۔ اس پر نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ ـــ سلمان من اھل بیتی ـــ یعنی سلمانؓ میرے اہلِ بیت میں سے ہے۔ (بحوالہ ازالۃ الخلفا۔ شاہ ولی اللہؒ)

یوں حضرت سلمان فارسیؓ کا شمار "اہلِ بیت" میں کر لیا گیا۔ اس کے بعد، کتبِ روایات میں مذکور ہے کہ جب سورۂ جمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ (۶۲/۳) نبیٔ اکرمؐ اپنی قوم مخاطب کی طرف بھی رسول ہیں اور ان کی طرف بھی جو ان کے بعد آنے والے ہیں، تو صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ ان (بعد میں آنے والوں) سے کون لوگ مراد ہیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ آپ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ان کے زانو (یا سر) پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ وہ اس کی قوم کے افراد ہوں گے اور ان میں ایک شخص اس عظمت و شان کا پیدا ہوگا کہ ایمان خواہ ثریا میں بھی کیوں نہ ہو، وہ اسے وہاں سے بھی اتار لائے گا اور علمِ اوّلین و آخرین کا وارث ہوگا۔ اسی طرح جامع ترمذی میں ہے کہ جب آیت ـــ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ۔ (۴۷/۳۸) نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم دین سے پھر جاؤ گے، تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ تو

لوگوں نے پوچھا کہ یارسولؐ اللہ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چُن لے گا۔ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ـــ اس کی قوم کو، اس کی قوم کو۔

ان روایات کی رُو سے ایک تو عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کی برتری ثابت ہوگئی اور دوسرے، ایک "آنیوالے" کے عقیدہ کا دروازہ کھُل گیا۔

یہ ہیں حضرت سلمان فارسیؓ کے کوائف، جن کے متعلق شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد (اہلِ بیت کو چھوڑ کر) صرف تین مسلمان باقی رہ گئے تھے۔ یعنی حضرت مقدادؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ[1]

(۰)(۰)

---

[1] میں نے اسکا حوالہ "فروعِ کافی، باب الروضہ" لکھ رکھا ہے لیکن اس وقت میرے پاس فروعِ کافی کی جلد اوّل ہے۔ جس میں باب الروضہ نہیں۔ وہ باب غالباً اس کی دوسری جلد میں ہے لیکن شیعہ حضرات کے ہاں یہ روایت مسلّم ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں انہیں دو اور اصحاب کا بھی اضافہ ہے۔ یعنی حضرت علیؓ کے غلام حضرت قنبر اور حضرت عمار بن یاسرؓ کا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کے دعویٔ خلافت کی تائید کی تھی۔

"تاریخ المورخ" کا جو اقتباس پہلے درج کیا جا چکا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ ایرانی اس گھرانے کو تاج پہنا نہ سکے جنہیں تاج پہنانے کے لئے انہوں نے اپنی کوششیں صرف کردی تھیں لیکن، انہوں نے، سلطنت، بنی امیہ کے ہاتھ سے چھین کر، بنو عباس کے ہاتھ میں دے دی جو رسول اللہ کے قرابتدار تھے۔ چونکہ ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے کے ایرانیوں نے کس طرح اسلامی مملکت میں اندرونی خلفشار پیدا کر کے، اسے کمزور کردیا، اس لئے تاریخ کا یہ گوشہ بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ان سازشوں کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا جن کے نتیجہ میں سلطنت، بنی امیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئی اور پھر سقوطِ بغداد کے بعد اس کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

امام حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری

حضرت علیؓ کے زمانے میں، مملکت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ــــ ایک حصہ حضرت علیؓ کے زیرِ اقتدار تھا جس کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔ دوسرا حصہ حضرت معاویہؓ کے زیرِ نگین۔ اس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، ان کے بڑے صاحبزادہ، امام حسنؓ ان کے جانشین ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد، وہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ ابن خلدون کی تصریح کے مطابق،

> امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کوفہ کے بیت المال میں جس قدر رقم ہے وہ انہیں دے دی جائے۔ اس رقم کی مقدار پانچ کروڑ تھی۔ نیز یہ کہ دارا بجرد کا خراج بھی (جو فارس کا ایک حصہ تھا) انہیں ادا کیا جاتا رہے۔
>
> (ابن خلدون، جلد ۲، صہ ۴۵۶)

اس معاملہ کے طے پا جانے کے بعد، سلطنت پوری کی پوری امیر معاویہؓ (بنی امیہ) کی طرف منتقل ہو گئی۔ واضح رہے کہ ان حضرات کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے

حسنینؓ کے امیر معاویہؓ کے ساتھ تعلقات

(مثلاً) علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:-

> جب خلافتِ معاویہؓ قائم ہو گئی تو (حضرت) حسینؓ اپنے بھائی (حضرت) حسنؓ کے ساتھ ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کی بڑی عزت کرتے، نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے، اور گراں قدر عطیات سے انہیں نوازتے۔ انہوں نے ایک ایک دن میں دو دو لاکھ درہم عطا

کیئے۔ (البدایہ والنہایہ۔ جلد ۸)

یہ سلسلہ امام حسنؓ کی وفات کے بعد، امام حسینؓ کے ساتھ بھی جاری رہا۔ نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ

> معاویہؓ دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم عطا کیئے اور ان کے فرزند (یزید) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسے دگنا کر دیا۔ یہ عطایا حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں، امام حسنؓ و حسینؓ کو ہر سال عطا ہوتے تھے۔ (شرح ابن ابی الحدید، جلد ۲)

باہمی رشتہ داریاں

پھر ان کی باہمی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ (مثلاً) امام حسینؓ کی بھتیجی، یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی صاحبزادی سیدہ امِ محمد، یزید کے عقد میں تھیں اور امام حسینؓ کی زوجۂ محترمہ (والدۂ حضرت علی اکبر) امیر معاویہؓ کی حقیقی بھانجی تھیں۔

جب سلطنت، بنی امیہ کی طرف منتقل ہو گئی تو ایرانیوں کی سازشوں کا رُخ بھی انہی کی طرف پھر گیا۔ اس مقصد کے لئے انہیں بنی عباس کی شکل میں ایک مؤثر مہرہ ہاتھ آ گیا۔ بنی عباس اور بنی امیہ ایک ہی

بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس کی رقابت

شجر کی دو شاخیں تھیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے شجرۂ نسب پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہو گا۔

قریش میں عبد مناف ایک ممتاز شخصیت گزری تھی۔ وہ ان دونوں خاندانوں کا مورث تھا۔ اس سے سلسلہ یوں آگے چلا:۔

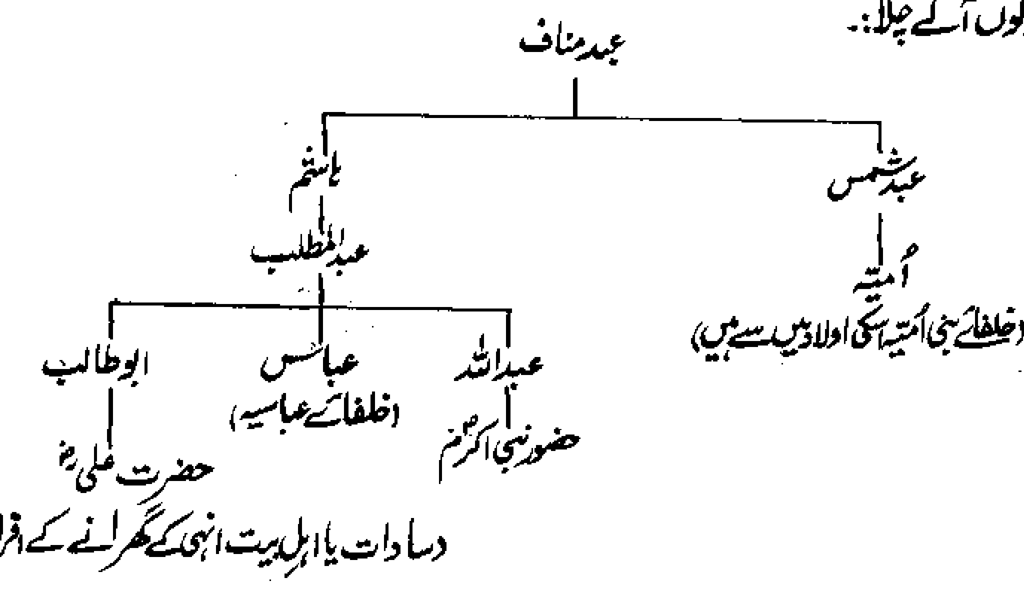

بنی امیہ برسرِ اقتدار آئے تو بنی عباس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایرانی اس قسم کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ اس مقام پر تاریخ میں ایک اور شخصیت سامنے آتی ہے جو ابو مسلم خراسانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈہ کا سب سے بڑا داعی تھا۔ بنی عباس کی اپنی کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس کی بنا پر عوام کو ان کا طرفدار بنایا جا سکتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ابو مسلم نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ البتہ اس کا ہدف تبدیل کر دیا۔ اس نے اس عقیدہ کو پھر سے عام کیا کہ خلافت "اہلِ بیت" کا حقِ وراثت ہے۔ یہ انہی کو ملنی چاہیئے۔ "اہلِ بیت" کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل شجرۂ نسب کا سامنے لانا ضروری ہے۔

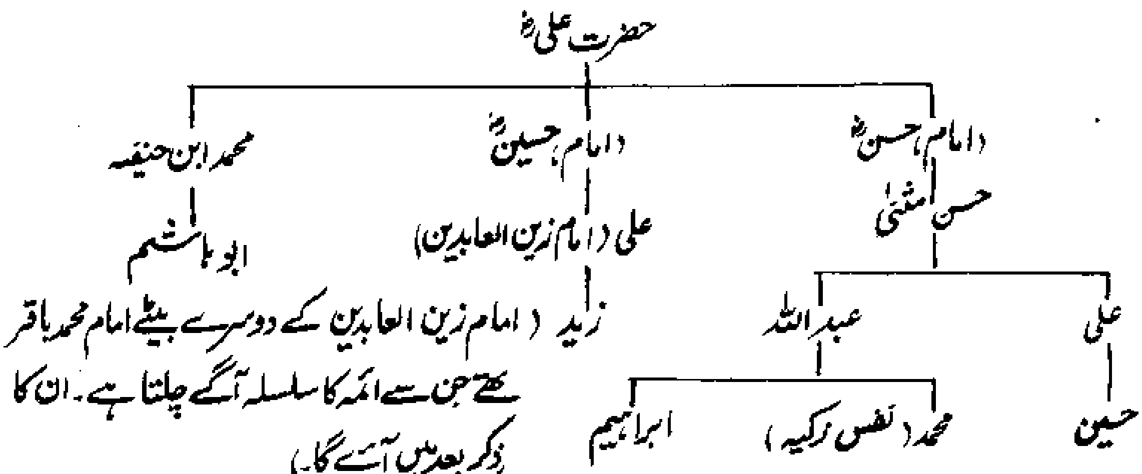

سادات اور علوی

امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ ان کی اولاد کو عام طور پر سادات کہا جاتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں جن سے آپ کے ہاں بکثرت اولاد ہوئی۔ روایات کی رُو سے، ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو بیٹے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ، دوسری بیویوں سے پیدا ہوئے، ان کی اولاد علوی کہلاتی ہے۔ (مندرجہ بالا شجرۂ نسب میں، ہم نے ان میں سے اُن کے صرف ایک بیٹے، محمد ابن حنفیہ کا نام لکھا ہے کیونکہ موضوع زیرِ نظر سے سرِدست انہی کا تعلق ہے) شیعوں کے دو معروف فرقے (اثنا عشری اور اسماعیلی، جن کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آتا ہے) امامت کو امام زین العابدین کے بیٹے امام باقر اور ان کی اولاد میں متوارث تسلیم کرتے ہیں لیکن ایک فرقہ (زیدیہ) اسے، ان کے دوسرے بیٹے، زید کی طرف منتقل شدہ سمجھتا ہے۔ ان کا ایک اور فرقہ، امامت کو حضرت علیؓ کے بعد، ان کے بیٹے

محمد ابن حنفیہ کی طرف منتقل کرتا ہے، اسے فرقہ کیسانیہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس مقام پر ان حضرات (اور فرقوں) کا اجمالی سا تعارف اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ بنی امیہ کے خلاف جو محاذ قائم ہوئے تھے، ان میں اگرچہ سب سے نمایاں حیثیت بنو عباس کی تھی، لیکن چند ایک مقامات پر، فاطمیین اور علویین نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

خلفائے بنی امیہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیٹے، علی کو ایک گاؤں حمیمہ میں، جو مدینہ سے دمشق کے راستے پر واقعہ تھا، جاگیر عطا کر رکھی تھی۔ وہ اسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ فرقہ کیسانیہ کے امام ابو ہاشم کا ادھر سے گزر ہوا اور اتفاقاً ان کا انتقال حمیمہ میں ہو گیا۔ چونکہ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا، اس لئے بنی عباس نے دعویٰ کر دیا کہ وہ علی کے لئے حقِ امامت کی وصیت کر گئے ہیں۔ اس طرح بنو عباس کے دل میں امامت کا داعیہ پیدا ہو گیا اور کیسانیہ ان کے داعی بن گئے۔ علی کی وفات کے بعد، ان کا بیٹا محمدؐ امام قرار پایا۔ اس نے سوچا کہ بنی عباس کے نام میں کوئی ایسی کشش نہیں جس سے عوام ان کی طرف راغب ہو جائیں، اس لئے اس نے اپنے دعاۃ سے کہا کہ وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں کسی کا نام نہ لیں، بلکہ کہیں کہ امامت "اہلِ بیت" کا حق ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے خراسان کو اپنا مرکز قرار دے لیا کیونکہ وہاں ایرانیوں کی تائید بآسانی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس مقام پر ابو مسلم خراسانی

ابو مسلم خراسانی

ہمارے سامنے آتا ہے۔ ابراہیم بن عثمان بن بشار اس کا نام تھا۔ یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہر کی اولاد سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ بلا کا ذہین اور اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے ابراہیم نے ان کی صلاحیتوں کو بھانپا اور پراپیگنڈہ کا شعبہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے "اہلِ بیت" کے نام سے اس قدر شد و مد سے پروپیگنڈہ کیا کہ سلطنتِ بنی امیہ کی بنیادوں میں تزلزل واقعہ ہو گیا۔ اس دوران میں، فاطمیین نے بھی بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائیاں کیں۔ (مثلاً) ۶۱ھ میں کربلا کا واقعہ ظہور میں آیا۔ ۱۲۲ھ میں، امام زین العابدین کے فرزند، زیدؒ نے کوفہ سے بغاوت کی۔ ۱۲۶ھ میں زید کے بیٹے یحییٰ نے خراسان سے۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد میں سے، عبداللہ ابن معاویہ نے ۱۲۷ھ میں کوفہ سے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکے[1]۔

---

[1] فاطمیین نے اپنی سلطنت، پہلے شمالی افریقہ اور بعد میں مصر میں قائم کی۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئیگا۔

لیکن ابو مسلم کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوگیا۔ اس زمانے میں ایک "آنے والے" (مہدی)، کا عقیدہ بھی عام ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی روایات بھی پھیلائی جا رہی تھیں کہ وہ آنے والا، خراسان کی طرف سے آئے گا۔ اس کے لشکر کا لباس بھی سیاہ ہوگا اور جھنڈے بھی سیاہ رنگ کے۔ ابو مسلم نے اس "آنے والے" کا پراپیگنڈہ بڑی شدّ و مد سے کیا اور جب دیکھا کہ فضا سازگار ہوگئی ہے تو وہ سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈے کے ساتھ ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ نکلا۔ اس نے ۱۲۸ھ میں خراسان فتح کر لیا اور ۱۳۲ھ میں، ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد، بنی امیّہ کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت بنو عبّاس کی طرف منتقل ہوگئی۔ ان کا پہلا خلیفہ عبداللہ تھا، جو سفّاح کے لقب سے مشہور ہے۔ بنی عبّاس نے بنی امیّہ سے جو انتقام لینا تھا وہ تو لیا، لیکن اس خطرہ کے ماتحت کہ ابو مسلم کہیں زیادہ طاقت نہ پکڑلے، ۱۳۷ھ میں اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔

"امامِ مہدی" کی آمد

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عبّاسیوں نے سلطنت "محبّتِ اہلِ بیت" کے نقاب میں حاصل کی تھی۔ اہلِ بیت کو یہ بات فطرۃً کھٹک رہی تھی کہ سلطنت حاصل کرنے کے لئے ہر جگہ ان کا نام لیا گیا اور جب وہ حاصل ہوگئی تو بنو عبّاس اس کے مالک بن بیٹھے۔ چنانچہ محمد نفسِ زکیہ ان کے خلاف اٹھے لیکن ناکام رہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ امامت کی وارث حضرت علیؓ کی اولاد ہے، حضرت عبّاس کی نہیں۔ عبّاسی خلیفہ منصور نے ان کے اس دعویٰ کی تردید کی اور کہا کہ وراثت کے اصول کے مطابق خلافت، آلِ عبّاس کو ملنی چاہیئے۔ اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔ ہم اسے بتمامہ نقل کرتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ خلافت، جو قرآنی اصول کے مطابق، بلا لحاظ نسل و نسب صرف جوہرِ ذاتی کی بنا پر کسی کو امّت کے مشورے سے تفویض ہونی چاہیئے تھی، کس طرح وراثت قرار پاگئی۔

حقِ خلافت کے متعلق خط و کتابت

خط و کتابت ملاحظہ فرمائیے۔ پہلا خط خلیفہ ابو جعفر عبداللہ بن محمد (منصور۔ عبّاسی خلیفہ) کا، محمد بن عبداللہ (نفسِ زکیہ) کے نام ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور دنیا میں فساد پھیلائیں، ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں برخلاف کاٹ

لئے جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں۔ اس لئے میں اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا واسطہ دے کر عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے کہ میں تمہارے اوپر قابو پاؤں تم توبہ کر لو گے تو میں تمہاری اور تمہارے تمام بھائیوں کی اور ساتھیوں کی اور معتقدوں کی جو اس بغاوت میں شریک ہیں، جان بخشی کر دوں گا۔ نیز دس لاکھ درہم تم کو دوں گا کہ جہاں چاہو رہو اور تمہاری جو ضروریات ہوں گی ان کو پورا کرتا رہوں گا۔ تمہارے اہل بیت اور شیعہ میں سے جو لوگ میرے قید خانوں میں ہیں، ان کو چھوڑ دوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو اپنے کسی معتمد کو بھیج دو تاکہ آ کر مجھ سے عہد نامہ لکھوا لے۔"

اس کے جواب میں نفس زکیہ نے لکھا:

از جانب محمد بن عبداللہ مہدی امیر المومنین بنام عبداللہ بن محمد۔ میں بھی تمہارے لئے اسی قسم کی امان پیش کرتا ہوں جس قسم کی تم نے پیش کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے اس کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے باپ حضرت علی کرم اللہ وجہ، وصی اور امام تھے۔ ہم جو ان کے بیٹے ہیں، زندہ ہیں۔ پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے اس کے وارث بن گئے۔ تمہیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جو نسبی فضائل و مفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکے۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم۔ خاص کر ہاشم کی اولاد میں، میں نسب میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں۔ میری رگوں میں امہات اولاد کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا۔ دنیا میں سب سے افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ صحابہؓ میں میرے باپ حضرت علیؑ اسلام میں سب سے اوّل، علم میں سب سے فائق اور جہاد میں سب سے افضل تھے۔ میری ماں حضرت خدیجہؓ ہیں جنہوں نے اس اُمّت میں سب سے پہلے نماز پڑھی۔ پھر حضرت فاطمہؓ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنّتی عورتوں کی سردار ہیں۔ زمانۂ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت حسنؑ اور حسینؓ ہیں جو بہشتی نوجوانوں کے سیّد ہیں۔ ان میں سے بڑے کا میں بیٹا ہوں۔ اب دیکھو۔ حضرت علیؑ والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں۔ امام حسنؑ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف سے رسول اللہ کا بیٹا

ہوں۔ اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جہنم میں بھی اس نے اس کا لحاظ کیا۔ یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا۔ اس طرح پر نیکوں میں سب سے بہتر، نیک اور گنہگاروں میں سب سے کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کر کے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی مسلم یا معاہد کے حق کے جو تمہارے ذمہ ہو امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمہارے عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کون سی ہے؟ ابن ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابومسلم خراسانی کو دی تھی۔" فقط

منصور کو جب یہ خط پہنچا تو اس کے کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منصور نے کہا کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آ پڑے تو خود مجھے جواب لکھنا چاہیئے۔ اس نے لکھا:۔

از ابو جعفر عبداللہ بن محمد امیر المومنین بنام محمد بن عبداللہ۔

تمہارا خط مجھ کو ملا۔ عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلا میں مقبول بننے کے لئے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں جن کی ساری بنیاد عورتوں پر ہے۔ حالانکہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار شخص زندہ تھے۔ (حمزہ، عباس، ابوطالب اور ابولہب) ان میں سے دو اسلام لائے، جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمہارا باپ تھا۔ تم نے عورتوں کا ذکر کر کے ان کی قرابت پر جو فخر کیا ہے، یہ نادانی ہے۔ اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسولؐ اللہ کی والدہ کے لئے ہوتی۔ لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سربلند کرتا ہے۔

تعجب ہے کہ ابوطالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو پر بھی تم نے ناز کیا ہے۔ سوچو تو کہ ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمہارا نسب والدین کی طرف سے رسولؐ اللہ تک پہنچتا ہے۔ اگر

یہ واقعی کوئی فضیلت ہوتی تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسول اللہ کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ۔(۳۳/۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے۔

ہاں تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بے شک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعے سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔ اسی قرابت کی بنیاد پر تمہارے باپ حضرت علیؓ نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فاطمہؓ کو ابو بکرؓ سے لڑا کر رنجیدہ کیا۔ اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو اطلاع نہیں کی اور جب انہوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو لے جا کر ان کو دفن کر دیا مگر کوئی ابو بکرؓ کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا۔ خود آں حضرتؐ کی بیماری کے زمانے میں بھی وہ موجود تھے لیکن نماز پڑھانے کا حکم آپؐ نے ابو بکرؓ کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہو گئے۔ پھر خلافت اصحاب شوریٰ میں آئی۔ اس میں بھی وہ انتخاب میں نہ آ سکے اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ ان کے بعد انہوں نے طلحہؓ اور زبیرؓ پر سختی کی۔ سعدؓ بن ابی وقاص سے بیعت لینی چاہی۔ انہوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔ جب علیؓ گزر گئے۔ امام حسنؓ ان کی جگہ پر آئے۔ معاویہؓ نے شام سے لشکر کشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رقم ان سے لے کر اپنے شیعہ اور خلافت دونوں کو معاویہؓ کے سپرد کر دیا اور مدینہ چلے گئے۔ لہٰذا، اگر تمہارا کچھ حق بھی تھا تو تم اس کو فروخت کر چکے۔ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمہارے امتیاز کا لحاظ رکھا، تمہارے باپ ابو طالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا' نہایت افسوسناک ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لئے فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمہاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے تم آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو، حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔ خود تمہارے خاندان میں زین العابدین تھے۔ وہ تمہارے دادا حسن بن حسن سے بہتر تھے۔ پھر ان

کے بیٹے محمد باقر تمہارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں۔ حالانکہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعوے کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کل بنی ہاشم سے بہتر ہو۔ بنی ہاشم میں سے رسول اللہؐ بھی ہیں۔ تمہیں یہ تو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملے میں تمہارے باپ حضرت علیؓ نے پنچوں سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلے پر رضامند ہو جائیں گے۔ تم نے یہ سنا ہو گا کہ پنچوں نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمہارے عم حسینؓ ابنِ علیؓ ابنِ زیاد کے مقابلے کے لئے کوفہ میں آئے اور جو لوگ ان کے حامی تھے، انہی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمہارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لئے اٹھے۔ بنی امیہ نے ان کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمہارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمہارے اوپر جو لعنتیں بھیجا کرتے تھے، اس کو بند کیا۔ تمہارے رتبے بڑھائے۔ اب انہی امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علیؓ کی فضیلت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو عباسؓ و حمزہ (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ محفوظ گزر گئے اور حضرت علیؓ ان جنگوں میں پڑے جن میں مسلمانوں میں خون ریزی ہوئی۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ زمانۂ جاہلیت میں سقایۂ حاج اور زمزم کے متولی حضرت عباسؓ تھے نہ کہ ابوطالب۔ حضرت عمرؓ کی عدالت میں تمہارے باپ نے اس کا دعوے بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

رسول اللہؐ نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباسؓ کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لئے کل اولاد عبدالمطلب میں سے آنحضرتؐ کے وارث وہی ہیں۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت سے لوگ خلافت حاصل کرنے کے لئے اٹھے لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا۔ لہٰذا قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد ہی کے حصہ میں آئی۔

بدر کی لڑائی میں تمہارے چچا طالب اور عقیلؔ کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباسؓ کو بھی آنا پڑا۔ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مر جاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے۔ نیز آغازِ اسلام میں قحط کے زمانے میں حضرت عباسؓ ہی نے ابوطالب کی امداد کی۔ پھر تمہارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں انہوں نے ہی ادا کیا۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تمہارے اوپر ہیں۔ ہمارے باپ نے تمہارے باپ پر احسان کئے اور ہم نے تمہارے اوپر اور جن رتبوں پر تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے، ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لئے۔ والسلام۔

"ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کا تصوّر دماغوں سے کس قدر بعید ہو چکا تھا کہ ابوجعفر منصور جیسا اہلِ سنّت کا عظیم الشّان خلیفہ اور نفس زکیہ جیسا اہلِ بیت کا مہدی تسلیم کیا ہوا امام اس کو وراثت تسلیم کر رہے ہیں۔ صرف جھگڑا یہ ہے کہ یہ وراثت بیٹی کی اولاد کو پہنچتی ہے یا چچا کی[1]۔"

(تاریخ الامّت، جلد ہشتم، علامہ اسلم جیراجپوریؒ)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس خط و کتابت میں بجز خاندانی تفاخر اور طعن و تشنیع کے، کچھ نہیں۔ اس کے بعد منصور نے ایک لشکرِ جرّار، (امام) نفس زکیہ کے خلاف بھیجا جس نے انہیں شکست دے کر قتل کر دیا۔ یہ ۱۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

(•)

ابومسلم، ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا۔ یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کے بعد ایک ایرانی، فرد نہیں، بلکہ خاندان، اسی عزم کو لے کر عباسیوں کے ہاں آگیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت

---

[1] اسی قسم کی ایک بحث خلیفہ مامون الرشید اور امام علی رضا کی عیون الاخبار میں منقول ہے۔ مامون نے امام موصوف سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہو؟ بولے کہ رسول اللہ سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی قرابت پر۔ مامون نے کہا کہ اگر حضرت علیؓ کی قرابت کی بنیاد پر یہ دعویٰ ہے تو آنحضرتؐ نے ایسے ورثہ چھوڑے تھے جن میں سے بعض ان میں سے بھی زیادہ قریبی اور بعض انہی کے درجہ کے تھے اور اگر فاطمہؓ کے رشتہ کی بنیاد پر ہے تو ان کے بعد اس کے حقدار حسنؓ اور حسینؓ تھے۔ ان کی موجودگی میں حضرت علیؓ نے خلافت پر قبضہ کر کے اُن کا حق کیوں غصب کیا۔ امام علی رضا نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا۔

کو زندہ تو نہ کر سکا، لیکن اس نے مسلمانوں کی اس عظیم مملکت (عباسیہ) میں نہ اسلام رہنے دیا نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیت نے لے لی اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔ تاریخ میں یہ خاندان برامکہ کے لقب سے

برامکہ

مشہور ہے۔ برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے لیکن اکثریت کا خیال ہے کہ اس لفظ کی اصلیت "برِ ماہ گاہ" ہے۔ یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری۔ اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برمکیوں کا جدِ امجد، جاماسپ بن پشتاسپ تھا جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موبد مقرر ہوا اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری مملکت کا موبدِ موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔ یہ وہ اعلیٰ ترین منصب تھا جس کے سامنے شہنشاہوں تک کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اس کے بعد اسے مملکت کا دستورِ اعظم (یعنی وزیر اعظم) بھی مقرر کر دیا گیا۔ اس خاندان کی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ایران کے پیامبر (جناب) زردشت نے اپنی بیٹی کا نکاح، جاماسپ سے کر دیا تھا اور جاماسپ کی ایک بھتیجی (جناب) زردشت سے منسوب تھی۔ ہم پہلے عباسی خلیفہ (عبد اللہ بن محمد بن علی، ملقب بہ سفاح) کے دربار میں، خالد برمکی کو ایک نہایت بلند ذمہ دار منصب پر فائز دیکھتے ہیں۔ (چونکہ ہمارے پیشِ نظر برامکہ کی تاریخ نویسی نہیں، اس لئے ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کیسے ہوا تھا۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ بنو عباس کے سب سے پہلے خلیفہ کے زمانہ ہی میں اس خاندان نے اس قدر اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا، خلیفہ کے ساتھ خالد کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خلیفہ کی بیٹی کو، خالد کی بیوی نے دودھ پلایا تھا اور خالد کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے۔ خلیفہ المہدی کے زمانے میں خالد کو صوبہ فارس کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔ خالد کا بیٹا یحییٰ اس سے بھی زیادہ زیرک اور قابل تھا۔ خلیفہ منصور نے اسے آذر بائیجان کا حاکم مقرر کر دیا لیکن خالد نے اس کے لئے، اس سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر گوشہ تلاش کیا۔ یعنی اسے ولی عہد ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ یہ اتالیقی، خاندانِ برامکہ کے لئے انتہائی عروج اور سطوت کا موجب بن گئی اور ایک گونہ موروثی قرار پا گئی۔ فضل اور جعفر، یحییٰ کے دو بیٹے، باپ اور دادا سے بھی زیادہ قابل تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کا سارا کاروبار یحییٰ کے سپرد تھا جسے وہ اپنے ان دونوں بیٹوں کے مشورہ سے سر انجام پاتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ خلافت نام کو عباسیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن درحقیقت برامکہ کی تحویل میں۔ اس خاندان نے مملکت میں سیاسی سطوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ مملکت کے ہر گوشے کو ایرانی رنگ میں

رنگ دیا۔ یحییٰ نے بغداد میں بیت الحکمۃ قائم کیا جس میں، عجم کی تاریخ اور لٹریچر کا معتدبہ ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بحث و مناظرہ کی مجالس بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیں۔

سارا معاشرہ عجمیّت کے رنگ میں

ان مجالس میں، ایرانی، یہودی اور نصاریٰ علماء اور فلاسفرز ایک طرف ہوتے تھے اور مسلمان علماء دوسری طرف اور موضوعِ بحث، اسلامی عقائد و نظریات ہوتے تھے۔ ان مباحثوں کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اول تو عرب سادہ سی قوم تھی جو فلسفیانہ نکات آفرینیوں اور منطقی موشگافیوں میں الجھنا جانتی ہی نہ تھی، پھر مملکت کی سیاسی مصلحتوں نے انہیں اس قدر دبا کر رکھا تھا کہ ان کا جذبۂ حریت ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے مدِ مقابل، اُس ایرانی قوم کے اہلِ علم و دانش تھے جو قرنہا قرن سے فلسفہ، منطق اور الہٰیات کے مسائل پر غور و فکر کے حامل تھے، ان کے ساتھ یہود و نصاریٰ (جو، یوں کہیے کہ، یونانی فلسفہ کے ماہر تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہر مباحثہ کے بعد، اسلامی عقائد و نظریات کے متعلق شکوک و شبہات کا سیلاب امنڈ آتا اور ان کے مقابلہ میں، عجمی تصورات و معتقدات نہایت معقول دکھائی دیتے۔ علاوہ ازیں، مملکت کے سارے خزانے برامکہ کی تحویل میں تھے۔ یہ ان (مجوسی، یہودی اور عیسائی) مناظرین کو اس قدر انعام و اکرام سے نوازتے کہ ان مذاہب کے علماء دُور دُور سے کھنچ کر ان مجالس میں شامل ہوتے۔ برامکہ کی اس سازش سے قرآنی اسلام کس طرح عجمی اسلام بن کر رہ گیا، اس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی کیونکہ سرِدست ہم اپنی بحث کو ایرانیوں کے سیاسی اثر و غلبہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

یحییٰ برمکی کی اولاد تو خاصی تھی لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ان میں سے فضل اور جعفر بڑے نامور تھے۔ عباسی خاندان میں برامکہ کے علوِ مرتبت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ فضل اور ہارون الرشید دودھ شریک بھائی تھے۔ یعنی ہارون الرشید کی والدہ خیزران نے (جو تاریخ میں نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے) اپنے بیٹے ہارون اور فضل کو ایک ساتھ دودھ پلایا تھا۔ اس کی گود میں ایک طرف ہارون ہوتا تھا اور دوسری طرف فضل۔ جب ہارون برسرِ اقتدار آیا تو اس نے فضل کو مملکت کے بلند ترین مناصب پر فائز کرنا چاہا لیکن (جس طرح خالد نے یحییٰ کے سلسلہ میں کیا تھا) یحییٰ نے مصلحتاً فضل کو محلات کے اندر رکھا اور امورِ مملکت جعفر کے سپرد کئے۔ یوں مملکت کی داخلی اور خارجی شاہ رگیں ان دونوں بھائیوں کی گرفت

میں چلی گئیں۔ اس گرفت کا رُخ متعیّن کرنے کے لئے، ان کے بوڑھے باپ (یحییٰ) کا تجربہ ان کے ساتھ تھا۔ سلطنت کلیتہً ان تینوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن، جیسا کہ عام طور پر ہوا کرتا ہے، قوت، ثروت، دولت اور حکومت کے نشہ نے ان کے ہوش د حواس پر اثر ڈالنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی سازشی کارروائیوں میں احتیاط برتنی چھوڑ دی اور رفتہ رفتہ ہارون الرشید پر ان کی حقیقت بے نقاب ہونی شروع ہو گئی۔ یہیں سے ان کے زوال کی ابتداء ہوئی۔ ہارون الرشید جب بھی ملک میں دورہ کرتا تو جس جس جگہ اس کے خیمے نصب ہوتے، اسے معلوم و محسوس ہوتا کہ وہاں حکومت برامکہ کی ہے، اس کی نہیں۔ اس سے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہونی شروع ہو گئی جو آہستہ آہستہ برامکہ کی تباہی کا موجب بنی۔ اس نے جعفر کو قتل کرا دیا۔ یحییٰ اور فضل کو قید کر دیا اور انہیں

برامکہ کا انجام

اس قدر اذیتیں دیں کہ ان کی تفصیل سن کر روح کانپنے لگتی ہے۔ اس نے خاندانِ برامکہ کی تمام جائیدادیں ضبط کر لیں۔ مملکت سے ان کا صفایا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے جعفر کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس نے ہارون الرشید کی ہمشیرہ کے ساتھ خفیہ نکاح کر لیا تھا لیکن محققین کے نزدیک اس "واقعہ" کی حیثیت افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ جعفر کے قتل اور دیگر برامکہ کے زوال کے اسباب وہی تھے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جنہیں ابنِ خلدون نے نہایت وضاحت سے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔

برامکہ بے شک ختم ہو گئے۔ وہ ایرانی سلطنت کا احیاء بھی نہ کر سکے لیکن وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے، اس میں بڑے کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عباسیوں کی عربی مملکت کو خالصتہً ایرانی، ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی اور ان کے مذہب (اسلام) کو عجمی بنا دیا۔ (ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جو اسلام اس کے بعد آگے چلا وہ عجمی اسلام تھا۔ محمد رسول اللہ کا لایا ہوا، دینِ خداوندی نہیں تھا)۔ ابو مسلم اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھا۔ اس نے ایرانی رضاکاروں کو عباسی فوج میں داخل کر کے، عسکری قوت کو بھی غیر عربی بنا دیا تھا۔ اس نے خالد برمکی کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا اور اسی کی سفارش پر اس نے عباسیوں کے دربار تک رسائی حاصل کی تھی۔ فضل برمکی نے اپنے عہدِ وزارت میں صوبہ خراسان میں جس قدر فوج بھرتی کی، وہ بھی خالص ایرانی تھی۔ اس فوج کی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ علاوہ ازیں، مملکت کے قریب قریب تمام کلیدی مناصب پر ایرانی (برامکہ) فائز تھے۔ مرکز اور اضلاع کے خزانوں پر ایرانی افسر مقرر تھے جس کا

نتیجہ یہ تھا کہ (عامِ عرب تو ایک طرف) خود خلیفہ ہارون الرشید کو بھی یحییٰ کی منظوری کے بغیر اپنی سلطنت کا خزانۂ عامرہ سے ایک پیسہ تک نہیں مل سکتا تھا۔

جب (امام) محمد بن علی عباس کا انتقال ہوا تو ابو مسلم نے امام کے ماتم میں فوج کی وردی سیاہ کردی اور مملکت کے علَم پر سیاہ حریری پردے چڑھا دیئے اور (امام) ابراہیم عباسی معہ اپنے خاندان کے سیاہ پوش ہو گئے اور اسی دن سے عباسیوں نے سیاہ لباس کو اپنا خاندانی شعار بنالیا۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہی سیاہ لباس اور علَم تھے، جو "آنے والے" کی روایتی نشانی بن کر ابو مسلم کی کامیابی کا باعث بنے تھے غور کیجئے کہ یہ شخص کس قدر ماہر شاطر تھا۔) ابو مسلم نے اس طرح عباسیوں کے ظاہری شعار کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا اور برامکہ نے ان کی نفسیات تک کو بدل کر عجمی بنا دیا اور سارا معاشرہ اسی رنگ میں رنگا گیا خالد کے عہدِ وزارت میں ایران کے جشنِ نوروز کا آغاز عباسی مملکت میں ہوگیا تھا اور جعفر برمکی نے اپنے دَور میں جشنِ مہرجان کی تقریب کو عام کردیا۔ یہ دونوں تقریبیں مجوسیوں کی عیدیں تھیں۔ (ایران میں اب تک جشنِ نوروز بطورِ عید منایا جاتا ہے)۔ ہمارے ہاں (یعنی..... مسلم ممالک میں) شبِ برات (یا براَت) کی تقریب اور اس کی آتش بازی خود برامکی آتش کدوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ برامکہ شیعہ تھے لیکن شیعہ مؤرخ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو شیعہ اور سنّی نسبتوں سے متعارف کرنا ہی غلط ہے۔ یہ اسلام تو لے آئے تھے لیکن مجوسیت ان کے رگ و ریشے میں حلول کئے ہوئے تھی۔ انہوں نے اپنے اسی قدیم ایرانی مذہب کے عقائد و تصوّرات کو اسلامی پردوں میں چھپا کر عام کردیا اور یہی ان کا مقصد تھا۔

عباسیوں کی داستان کا سلسلہ دراز ہے اور ایرانیوں کے ہاتھوں ان کی آخری تباہی کا زمانہ ہنوز دُور۔ اس مقام پر ہمیں تھوڑے سے وقت کے لئے رُک کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس دوران میں علویین اور فاطمین مصر کی سرگرمیاں کیا تھیں۔

فاطمینِ مصر

یہ اپنے انداز اور طریق کے مطابق، عباسی سلطنت کے خلاف وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے۔ تاریخی تحقیق کے مطابق، انہوں نے، ۱۳۸ھ سے لے کر ۳۵۸ھ تک، قریب باسٹھ مرتبہ حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ہر بار ناکام رہے[1]۔ ان میں سے

---

[1] بہ حوالہ "تحقیقِ مزید بہ سلسلۂ خلافتِ معاویہ و یزید" از محموداحمد عباسی۔

صرف ایک جماعت اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی جو فاطمیین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے خلیفہ نے رقادہ (شمالی افریقہ) میں، ۲۹۷ھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ یہ شیعوں کے مشہور فرقہ اسماعیلیہ سے متعلق تھا۔ ۳۵۸ھ تک اس سلطنت کا دائرہ شمالی افریقہ تک محدود رہا۔ اس کے بعد اس نے شام اور مصر کو بھی فتح کر لیا۔ اسی جہت سے اسے "دولتِ فاطمیینِ مصر" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور شیعہ مذہب (اسماعیلیہ) کے پھیلانے میں نمایاں سرگرمیاں دکھلائیں۔ اس مقصد کے لئے، قاہرہ میں ایک وسیع و عریض مسجد جامع تعمیر کی جس کا نام جامع ازہر رکھا۔ یہ مسجد درحقیقت اس مذہب کی نشر و اشاعت کا سرچشمہ اور مرکز تھی۔ (جامع ازہر مصر میں اب تک موجود ہے لیکن اب وہ سنّیوں کی درس گاہ ہے) رفتہ رفتہ داخلی انتشار کی وجہ سے اس حکومت میں ضعف آنا شروع ہو گیا جو اُس زمانے میں، جب صلیبی جنگیں شروع تھیں، انتہا تک پہنچ گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ حکومت، دوسری مسلمان حکومتوں کے ساتھ مل کر صلیبیوں کا مقابلہ کرتی، یہ خود صلیبیوں کے ساتھ مل گئی..... لیکن صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دی تو اس کے ساتھ ہی فاطمی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد، یہ مملکت دوبارہ عباسی سلطنت کا جزو بن گئی۔ یہ ۵۶۷ھ کی بات ہے۔

اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ دولتِ فاطمیہ کے حکمرانوں کا اپنے آپ کو فاطمی مشہور کرنا غلط تھا اس سلطنت کا بانی درحقیقت عبداللہ بن میمون القداح تھا جو ایران کا رہنے والا دہریہ تھا اور بظاہر (اسماعیلی امام) محمد بن اسماعیل کے نام پر بیعت لیتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فاطمی مشہور کر کے، اس آزاد مملکت کی بنیاد ڈالی تھی لیکن دوسرے محققین کا خیال ہے کہ یہ صحیح النسب فاطمی تھے۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عباسی سلطنت کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوئیں اور ان میں سے کون سی سازش کامیاب ہوئی۔ یہ سازش، بالواسطہ ایرانی تھی یا بلاواسطہ، اس سے ہمارے مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر قداح (ایرانی) خود فاطمی نہیں تھا تو فاطمیین کی کامیابی میں اس کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔

اب چلئے واپس بغداد کی طرف۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ پہلے ابو مسلم نے اور بعد میں برامکہ نے عباسی مملکت کو کس طرح ایرانی عقائد و تصورات کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔

(۰)

ابو مسلم قتل ہو گیا۔ برامکہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ، ایرانیت کا جو بیج بو گئے تھے، وہ بڑھتا پھولتا

پھیلتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عباسی سلطنت کا مرکز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا اور صوبے زور پکڑتے چلے گئے۔ ان میں ایران پیش پیش تھا۔ اس کی بین مثال دیالم (یا بنی بویہ) کی سلطنت ہے۔

دیلمی حکومت

دیالم کا خطہ جو بحرِ خزر کے جنوب میں واقع ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات میں شامل ہوا لیکن وہاں کے باشندے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے، بعد میں وہ مسلمان ہوگئے۔ بویہ دیلمی ان میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس کے تین بیٹے (علی، حسن اور احمد) بھی باپ کی طرح نامور تھے۔ ان میں سے علی نے خاصی قوت حاصل کر لی۔ یہ شخص دولتِ دیالم یا بنی بویہ کا بانی ہے۔ ان بھائیوں نے آہستہ آہستہ پہلے ایران کے مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی اور عراق تک کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد، بغداد کے بعض امراء کے ایماء پر، آگے بڑھے اور ۳۳۴ھ میں، احمد بغداد میں داخل ہوگیا۔ خلیفہ مستکفی نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ (اس سے آپ اس زمانے کے عباسی خلفاء کے "اقتدار" کا اندازہ لگا سکتے ہیں!) خلیفہ نے اس کی سلطنت کو تسلیم کر لیا اور علی کو عماد الدولہ، حسن

بغداد، شیعیت کا مرکز

کو رکن الدولہ، اور احمد کو معز الدولہ کے خطاب سے نوازا اور سکوں پر ان کے نام مسکوک کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ اس کے بعد کیفیت یہ تھی کہ خلیفہ صرف ایک مذہبی رئیس رہ گیا جس کا نام خطبوں میں لیا جاتا تھا۔ حکومت، بنی بویہ کے ہاتھ میں تھی۔ ابھی معز الدولہ کو زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لئے چالیس دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے خلیفہ مستکفی کو معزول کر کے قید کر دیا، اور وہ بھی نہایت ذلت آمیز طریق سے۔ بنی بویہ غالی شیعہ تھے۔ معز الدولہ وہ شخص ہے جس نے پہلے پہل بغداد میں عاشورہ محرم منانے کا حکم دیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ سب لوگ اپنی دکانیں بند رکھیں، امام حسینؓ کا ماتم کریں اور عورتیں اپنے بال کھول کر نوحہ کرتی ہوئی باہر آئیں۔ اسی طرح اس نے ۱۸ ذی الحجہ کو عیدِ غدیر منانے کا بھی فرمان جاری کیا۔ بغداد کی آبادی بالعموم سنیوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ان احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معز الدولہ نے ان پر سختی شروع کر دی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ بہت سے سنی وہاں سے ہجرت کر گئے۔ ۴۴۷ھ تک، بنی بویہ کی حکومت رہی جس کا خاتمہ سلاجقہ نے کیا۔ ان کی حکومت ۵۹۰ھ تک قائم رہی۔ سلاجقہ کے زوال کے بعد، قریب چھیاسٹھ سال تک بغداد میں عباسیوں

عباسی سلطنت کا خاتمہ

کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔ اس کے بعد اس سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چراغ گل ہوگیا۔ جب چنگیز خاں کا پوتا، ہلاکو خاں برسرِ اقتدار

آیا تو ابن العلقمی، خلیفۂ بغداد کا وزیر تھا۔ یہ غالی شیعہ تھا۔ دوسری طرف محقق نصیر الدین طوسی، جو اسی قسم کا شیعہ تھا، ہلاکوں خاں کا وزیر تھا۔ ان دونوں کی سازش سے، ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد خلیفہ مستعصم کو قتل کر دیا۔ اس سے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ محرم ۶۵۶ھ کا واقعہ ہے۔

اس طرح، ایرانیوں نے جنگِ قادسیہ کی شکست کا بھرپور انتقام لے لیا۔ یہ بنیادی طور پر اُس شکست کا سیاسی انتقام تھا جو انہوں نے مسلمانوں سے لیا۔

خود ایرانیوں کا اعتراف

ہم نے جو کہا ہے کہ اہلِ ایران نے اس طرح اپنی اس شکست کا انتقام لے لیا جو انہیں عربوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی تو یہ ہمارا قیاس نہیں۔ خود ایران کے اربابِ فکر و نظر اس کا اعتراف و اقرار کرتے ہیں۔ حسین کاظم زادہ، عصرِ حاضر کے مشہور ایرانی مورخ ہیں۔ وہ اپنی کتاب "تجلیاتِ روحِ ایران، در ادوارِ تاریخی" میں لکھتے ہیں۔

> جس دن سے سعد بن ابی وقاص ؓ نے خلیفہ دوئم کی جانب سے ایران کو فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا، ایرانی اپنے دل میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے۔ کینہ و انتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا تا آنکہ فرقۂ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیتہً بے نقاب ہو گیا۔ اربابِ علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد و ظہور میں، اعتقادی مسائل اور نظری اور نقلی اختلافات کے علاوہ، ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو نہ کبھی بھول سکتے تھے نہ قبول اور معاف کر سکتے کہ مٹھی بھر، ننگے پاؤں پھرنے والے، بادیہ نشین عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد یہ مورخ لکھتا ہے کہ:۔

> ہمارے دانشمند بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا اور نہ ہی خاندانِ بنی اُمیہ سے دشمنی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اپنی عظمت اور حکومت بحال ہو جائے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علیؓ کے بعد ختم ہو گئی، اور اموی، خالص عربی حکومت، دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی اور اس طرح عرب، عجم پر بری طرح مسلط ہو گیا۔ فلہٰذا،

ہمارے لئے واحد چارۂ کار یہی تھا کہ ہم ہاشمیوں کا ساتھ دے کر، ان کو ابھارتے: ہمارے بزرگوں نے یہی کچھ کیا۔[1]

جب ایرانیوں نے ہاشمیوں کو ابھار کر، اُموی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس جگہ خود ہاشمیوں (عباسیوں) کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہلاکو کو بلا کر، عربوں کی اس سلطنت کا بھی خاتمہ کرا دیا۔ اس طرح انہوں نے بقول قاسم زادہ، اپنی شکستوں کا بدلہ، عربوں سے لے لیا۔

لیکن یہ بدلہ وہ تھا جو انہوں نے عربوں (یا مسلمانوں) سے لیا۔ جو بدلہ انہوں نے اسلام سے لیا (جس لے ان کے مذہبِ مجوسیت کا خاتمہ کر دیا تھا) اس کا تذکرہ اب سامنے آتا ہے۔

اسلام کی اساسات

قبل اس کے کہ ہم اسلام کے خلاف "عجمی سازش" کی تفاصیل کی طرف آئیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدیدِ یادداشت کے لئے) اس دین کی اساسات کو مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے جسے اللہ تعالٰے نے نبیٔ اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو دیا؛ اور جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے۔

(۱) انسانی علم کا ذریعہ، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور تعلیم و تعلّم ہے۔ اس علم کو ہر انسان اکتسابی طور پر حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) لیکن ایک علم اور بھی تھا جسے اللہ تعالٰے اپنے مخصوص اور برگزیدہ بندوں کو براہِ راست عطا کرتا تھا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے اور جن حضرات کو یہ علم عطا ہوتا تھا انہیں انبیاء یا رسول۔ یہ علم آخری مرتبہ حضورؐ نبیٔ اکرمؐ کو عطا ہوا؛ اور اس کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ــــ بالفاظِ دیگر، نبوت حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد علم کا صرف اکتسابی ذریعہ باقی رہ گیا ــــ ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کو

---

[1] ہم نے پہلا اقتباس، محمود عباسی صاحب کی کتاب، "تحقیقِ مزید بہ سلسلۂ خلافتِ معاویہ و یزید" سے لیا ہے اور دوسرا ملخصًا خواجہ عباد اللہ اختر (مرحوم)، کے مقالہ "عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر" سے جو مجلہ طلوعِ اسلام کی نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔

براہِ راست خدا سے علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو وحی حضور نبی اکرمؐ کو دی گئی وہ بہ تمام و کمال قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے، مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی، محفوظ بھی ہے اور واضح بھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور غور و تدبر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے، اس کی موجودہ شکل میں، خود حضورؐ نبی اکرم نے امت کو دیا تھا اور اس کے بعد اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

(۴) دین، جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے، ایک نظامِ حیات ہے جو اپنی آزاد مملکت میں عملاً متشکل ہو سکتا ہے۔ یہ مملکت، امتِ محمدیہ کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے۔ یہ امت، اپنے میں سے بہترین فرد کو، بطور سربراہِ مملکت منتخب کرتی ہے اور یہ سربراہ، امت کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام دیتا ہے۔ مقصد اس مملکت کا قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا اور اس کے اصول و اقدار کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا ہوتا ہے۔

(۵) یہ مملکت، سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے قائم فرمائی اور حضورؐ کی وفات کے بعد، اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک آگے چلا۔ اس کے بعد امت کی گاڑی کسی اور پٹڑی پر چل نکلی۔ اسی کا نام دین میں عجمی تحریف ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اس کا اوّلین سرچشمہ سرزمینِ ایران تھی، اس لئے اسے "**عجمی تحریف**" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفہوم اس سے ہر وہ عقیدہ، تصور، نظریہ، مسلک و مشرب ہے، جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ وہ کہیں سے آیا ہو اور اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جاتی ہو۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ امت میں سب سے پہلا اختلاف مسئلہ خلافت کی بنا پر نمودار ہوا۔ حضرت علیؓ کے دعوائے خلافت کے سلسلہ میں کہا یہ گیا کہ خلیفہ منتخب نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے۔ اسے امام کہا جاتا ہے۔ پہلے امام حضرت علیؓ ہیں اور آپ کے بعد یہ امامت، آپ کی اولاد میں متوارث جاری رہے گی۔ اُس وقت ہم نے اس عقیدہ کے صرف اس گوشہ کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق سیاست سے تھا۔ یہ دین پر کس طرح اثر انداز ہوا، اس کا ذکر اب سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

ان حضرات کا شجرۂ نسب سامنے آجائے جنہیں ائمہ (حامل امامت) تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) حضرت علیؓ (م ۴۰ھ)

(۲) (امام) حسنؓ (م ۴۹ھ)

(۳) (امام) حسینؓ (م ۶۱ھ)

محمد بن حنفیہ

(۴) (امام) زین العابدین (م ۹۵ھ)

زید

(۵) (امام) باقر (م ۱۱۴ھ)

(۶) (امام) جعفر صادق (م ۱۴۸ھ)

اسماعیل

(باطنی فدائی، آغاخانی اور بوہرے وغیرہ انہی کی نسبت سے اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ یہ امامت کو انکی اولاد میں موروثی تسلیم کرتے ہیں۔)

(۷)۔ (امام) موسےٰ کاظم۔ (م ۱۸۳ھ)

(۸)۔ (امام) علی رضا۔ (م ۲۰۳ھ)

(۹)۔ (امام) محمد جواد (تقی)۔ (م ۲۲۰ھ)

(۱۰)۔ (امام) علی ہادی (نقی) (م ۲۵۴ھ)

(۱۱)۔ (امام) حسن عسکری۔ (م ۲۶۰ھ)

(۱۲)۔ (امام) محمد (امام غائب)

فرقہ کیسانیہ

شیعوں کا پہلا فرقہ کیسانیہ ہے جو حضرت علیؓ کے بعد، ان کے اس بیٹے (محمد بن حنفیہ) کو (جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہیں تھے بلکہ ان کی ایک اور بیوی، حنفیہ کے بطن سے تھے) امام مانتا تھا۔ بالفاظِ دیگر، اس فرقہ نے فاطمیین کے مقابلہ میں علویین کو ترجیح دی۔ جب ان کے امام (محمد بن حنفیہ) کی وفات ہوگئی تو ان میں کے ایک گروہ نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ امام محمد بن حنفیہ، مہدئ موعود تھے، وہ دراصل مرے نہیں بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگئے ہیں۔ عنقریب دنیا میں واپس آئیں گے اور اپنی حکومت روئے زمین پر قائم کریں گے۔ آپ نے دیکھا کہ عبداللہ ابن سبا نے رجعت کے جس عقیدہ کو پھیلایا تھا انہوں نے اس کا اطلاق کس پر کیا؟ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس عقیدہ کا

اطلاقِ اہلِ تشیع کی کئی ایک اور ہستیوں پر بھی ہوتا رہا ہے۔ کیسانیہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ امام، خدا کا مظہر یا اوتار ہوتا ہے اور خدا کی طرح حیٌ و قیوم۔ اس جماعت کا مرکز خراسان تھا جہاں سے وہ سلطنت بنی امیہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلاتے رہتے تھے۔

زیدیہ فرقہ

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ کہلاتا ہے۔ یہ، امامت کے متعلق حضرت علیؑ سے لے کر امام زین العابدینؒ تک جمہور شیعہ سے متفق ہیں، لیکن اس کے بعد، ان کے فرزندِ اکبر، امام باقرؒ کے بجائے، ان کے فرزندِ اصغر، زید کو امام تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علیؑ کی اولاد میں تو رہے گی لیکن اس کے لئے کسی سلسلہ یا خاندان کی تخصیص نہیں۔ یہ شیعوں کا معتدل ترین فرقہ ہے جو اصول و فقہ میں سنّیوں کے بہت قریب ہے۔

امامیہ و اسماعیلیہ

شیعوں کے جس گروہ نے امام باقرؒ کو امامِ برحق تسلیم کیا ، وہ ان کے بعد، ان کے بیٹے امام جعفر صادقؒ کی امامت کے بھی قائل رہے لیکن ان کے بعد یہ پھر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ انہی دو گروہوں نے تاریخ میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد، ان کے فرزندِ اکبر، اسماعیلؒ امامِ منصوص ہیں اور دوسرے گروہ نے، ان کے بجائے ان کے دوسرے بیٹے، امام موسیٰ کاظمؒ کو امام تسلیم کیا۔ اوّل الذکر کو، شش امامیہ (کیونکہ وہ پہلے چھ اماموں کو ائمہ برحق تسلیم کرتے ہیں) یا اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ باطنی فدائی اور اس قسم کے دوسرے غالی شیعہ فرقے، عام طور پر انہی سے متعلق ہیں۔ آجکل، آغاخانی اور بوہرے، اس فرقہ کی دو مشہور شاخیں ہیں۔ دوسرا فرقہ اثنا عشری یا امامیہ کہلاتا ہے اور جمہور شیعہ اسی سے متعلق ہیں۔ یہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور اس سلسلہ کے آخری امامؒ (محمد) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے وہ زندہ ہیں اور عراق کے ایک غار میں مستور۔ قیامت کے قریب، ان کا ظہور ہوگا اور وہ ساری دنیا پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔ (انہی کو امام مہدی کہا جاتا ہے۔)

شیعوں کا کوئی فرقہ بھی ہو، امام کے منصوص ہونے اور مہدویّت (یعنی ایک آنے والے امام) کا عقیدہ ان سب کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن ان کے بعض غالی فرقوں کے عقائد بڑے ہی غلو پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) ان

شیعوں کے غالی فرقے

کا ایک فرقہ "خرم دینیہ" ائمہ کو (معاذاللہ) خدا، رسول اور ملائکہ تصور کرتا اور قیامت اور حساب کتاب کا انکار کرتا تھا۔

تناسخ کا قائل تھا۔ اسی کو وہ رجعت کہتے تھے۔ یعنی انسانی روح کا (اسی دنیا میں) ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل ہو جانا۔ رجعت کے متعلق بعض غالی فرقوں کا عقیدہ تھا کہ قیامت کے قریب نبی اکرمؐ اور دیگر تمام انبیاءؑ دنیا میں واپس آئیں گے اور وہ سب حضورؐ کی نبوت کا اقرار کریں گے۔ اسی طرح حضرت علیؓ بھی دنیا میں واپس تشریف لائیں گے اور حضرت معاویہؓ اور ان کی اولاد کو قتل کریں گے۔ فرقۂ خطابیہ کا بانی، ابوالخطاب، امام جعفر صادقؒ کو (معاذ اللہ) خدا اور اپنے آپ کو ان کا رسول ظاہر کرتا تھا۔ بعض ائمہ جب اس قسم کے عقائد کی تردید اور مخالفت کرتے تو یہ لوگ کہہ دیتے کہ یہ حضرات ایسا کچھ تقیۃً کہتے ہیں، ورنہ دل سے یہ ہم سے متفق ہیں (تقیہ کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ بھی شیعوں کے تمام فرقوں میں مشترک ہے) خطابیہ کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہر دورِ رسالت میں دو پیغمبر ہوتے ہیں۔ ایک ناطق اور دوسرا صامت۔ محمد رسول اللہ ناطق پیغمبر تھے اور حضرت علیؓ صامت۔

بعض غالی فرقوں کے عقاید اس قدر مذموم تھے کہ ان کا ذکر کرنے سے بھی طبیعت ابا کرتی ہے لیکن یہ سب اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے۔ حکومتِ وقت کے خلاف سازشیں کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ حکومت بنی اُمیہ کی تھی یا بنی عباس کی، بہرحال سنیوں کی حکومت تھی۔ جب انہیں اپنی مساعی میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو یہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے تھے کہ خیر، کوئی بات نہیں، آخری زمانہ میں امامِ مستور آئیں گے اور شیعوں کی حکومت قائم کریں گے۔ یہ (غالی) فرقے اپنے اپنے وقت میں ابھرنے کے بعد ختم ہو گئے۔ (اب ان کے محض "نقوشِ قدم" بعض مقامات پر پائے جاتے ہیں لیکن انہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں) شیعوں کے دو فرقے البتہ ایسے ہیں جنہیں تاریخ میں نمایاں خصوصیت حاصل رہی ہے اور وہ اب بھی موجود ہیں۔ یعنی اسماعیلیہ (آغا خانی خوجے اور بوہرے) اور امامیہ (اثنا عشری) جن کی اکثریت ہے۔ ان دونوں فرقوں کے اہم عقائد کا ذکر ناگزیر ہے پہلے اسماعیلیہ کو لیجئے۔

اسماعیلیوں کے عقائد

اسماعیلی اپنے عقائد اور تعلیم کو اس شدت کے ساتھ مخفی رکھتے ہیں کہ ان کے متعلق کوئی بات یقینی طور پر کہنا مشکل تھا۔ (اس فرقہ کا تو نام ہی "باطنی" تھا۔) لیکن کچھ عرصہ پہلے، خود اسی فرقہ کے ایک محقق، ڈاکٹر زاہد علی (سابق پروفیسر عربی و وائس پرنسپل، نظام کالج حیدر آباد دکن) نے بڑی ہمت اور جرأت سے کام لیا اور اپنے فرقہ کی مستند (مخفی) کتب و دستاویزات سے مرتب کردہ، ایک کتاب شائع کر دی، جس کا نام ہے "ہمارے اسماعیلی مذہب کی

حقیقت اور اس کا نظام"۔ ہمارے سامنے اس کتاب کا ۱۹۵۴ء کا ایڈیشن ہے اور ذیل میں جو کچھ درج کیا جاتا ہے، اسی سے مقتبس ہے۔ اس فرقہ کی اساس اور تعلیم کے متعلق اس کتاب میں لکھا ہے کہ :-

اس دعوت کے بانی، ایرانی نژاد میمون القداح[1] یا ان کے فرزند سیدنا عبداللہ ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ایک ایسی مذہبی تحریک پیدا کرنا تھا جو خلافتِ عباسیہ کا مقابلہ کر سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے (امام عبداللہ نے) ایک انجمن بنائی جن میں ایسے افراد شریک کئے جو بالطبع معتزلیوں کے خیالات اور فلسفیوں کی رایوں کی طرف مائل تھے۔ اس تحریک کی کامیابی کے لئے اہلِ بیت کی مدد لینا پڑی تاکہ وہ شیعہ جن کو اہلِ بیت سے محبت تھی اسے جلد قبول کرلیں۔ (صہ ۶۱۱)

ان کی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر زاہد علی نے لکھا ہے کہ "ان کی ابتدائی بناء اس اصول پر ہے کہ آنحضرتؐ نے ظاہری شریعت وضع فرمائی اور مولانا علیؑ نے اس کے باطن یعنی تاویل کی تعلیم شروع کی۔ آپ کے بعد چھ اماموں نے باطنی تعلیم کی تکمیل کی اور ساتویں امام (مولانا محمد بن اسماعیل) نے شریعتِ محمدیہ کے ظاہر کو معطل کر دیا۔ آپ کی نسل سے جو ائمہ ہوئے اور قیامت تک ہوں گے، وہ سب خلفائے قائم ہیں۔ ان میں سے اگر کسی خلیفہ کو موقعہ ملے تو وہ قائم کی حیثیت سے ظہور فرمائیں گے اور تاویل، یعنی علمِ باطن ظاہر کر کے تمام دنیا کو اسماعیلی مذہب کا پیرو بنائیں گے .... اسماعیلی تعلیم کی بڑی خصوصیت رازداری اور پوشیدگی ہے۔ سیاسی مصلحتوں اور ملکی اعراض کے باعث ہم اپنے اصل عقیدے، اپنی دعوت کے بڑے بڑے ارکان کے سوا کسی دوسرے کو نہیں بتاتے تھے کیونکہ ہماری عام رعایا کا مذہب سنی تھا[2]۔ اس لئے ہم نے عام لوگوں کو جو تعلیم دی وہ اس تعلیم سے بالکل الگ تھی جو خاص خاص ارکانِ دعوت کو دی جاتی تھی بلکہ خود اسماعیلیوں میں بھی مستجیبوں، یعنی ابتدائی مدارج کے مومنین کو وہ بھید نہیں بتائے جاتے تھے جو بالغوں کو بتلائے جاتے" (مقدمہ ب۔ت)

ان کے عقائد کے متعلق لکھا ہے کہ "امام کو رفعِ شریعت" یعنی شریعت اٹھا دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ جب چاہے شریعت اٹھا سکتا ہے اور جب چاہے جاری کر سکتا ہے۔" قرآنِ کریم کے متعلق ان کا عقیدہ

---

[1] اس کا ذکر، حکومتِ فاطمیہ کے ضمن میں آچکا ہے۔

[2] یہ مصر کی فاطمی حکومت کے زمانے کی بات ہے۔

یہ ہے کہ "جس طرح یہود و نصاریٰ نے اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے علیحدہ کتابیں جمع کریں، مسلمانوں نے بھی اسی طرح کیا۔ رسولِ خدا نے کلام اللہ جمع کر کے اسے اپنے اصحاب کے سامنے اپنے وصی کے سپرد فرمادیا۔ یہ لوگ اس سے بے پرواہ ہو گئے اور اپنی رائے اور قیاس سے ایک الگ قرآن جمع کیا۔ اس کے بعد خلیفہ ثالث نے شیخین کا جمع کیا ہوا نسخہ جلا ڈالا اور ایک دوسرا نسخہ تیار کیا۔ پھر حجاج آیا اور اس نے خلیفہ مذکور کے نسخے کو لے کر آگ میں جھونک دیا۔ اس کے بعد اس نے چوچا ہا نکال دیا اور ایسی کتاب تالیف کی جواب اُن کے پاس موجود ہے۔" (مقدمہ)

محرف قرآن

ڈاکٹر زاہد علی نے ان اختلافات کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جو مسلمانوں کے مروجہ قرآن اور حضرت علیؑ کے مرتّب کردہ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سورہ مائدہ کی آیت (۵/۶۷) یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ فِیْ عَلِیٍّ..... (واضح رہے کہ حضرت علیؑ کے مرتّب کردہ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ان کے ائمہ کے پاس ہے اور اسے قائم القیامۃ ہی کھولیں گے)۔ تقیّہ ان کے ہاں بنیادی عقیدہ ہے ۔۔۔ نیز تاویل، جس سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا صحیح مفہوم اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کے باطنی معانی ہوتے ہیں جن کا علم ائمہ ہی کو ہوتا ہے۔ قرآن کا حقیقی مفہوم انہی باطنی معانی (یا تاویل) کی رُو سے متعین ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر، نبی کو رسولِ ناطق (یعنی ظواہر پر حکم کرنے والا) اور وصی کو رسولِ صامت (یعنی باطن پر حکم کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ تاویل کی بیّن مثال لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے باطنی معانی ہیں۔ یعنی " لا امام الا امام الزمان" (صہ ۲۰۸) یا (مثلاً) وضوء سے مراد حضرت علیؓ ہیں کیونکہ وضوء اور علی ہر ایک میں تین تین حرف ہیں اور صلوٰۃ (نماز) سے مراد آنحضرتؐ ہیں کیونکہ صلوٰۃ اور محمدؐ ہر ایک میں چار حرف ہیں۔ لہٰذا، لا صلوٰۃ الا بوضوء کے معنی ہیں مولانا علی کی وصایت (وصی ہونے) کے اقرار کے بغیر آنحضرتؐ کی نبوّت کا اقرار بے معنی ہے۔ (صہ ۲۲۴) یا (مثلاً) قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو شجرِ ممنوعہ کے استعمال سے منع کیا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ" امامِ مستقر مولانا ابوطالب نے آنحضرتؐ کو منع فرمایا تھا کہ تم (علم) تاویل کسی کو نہ بتانا۔ یہ صرف مولانا علیؑ کا حق ہے۔ ظالمِ اوّل (ابلیس) نے دھوکے سے کچھ (علم) باطن آنحضرتؐ سے سیکھ لیا۔ یہ آپؐ کا پہلا گناہ ہے۔ آپ کا پچھلا گناہ یہ ہے کہ آپ

باطنی معانی

نے اپنی ایک بیوی سے یہ راز کہہ دیا کہ تمہارے باپ میرے وصی کا حق ظلم سے چھین لیں گے[1]" (صہ ۴۶۱) یا (مثلاً) " الٓمّٓ ۔ ذَالِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ، میں ذَالِکَ اَلْکِتَابُ سے اشارہ مولانا علیؓ کی طرف ہے ۔" (صہ ۵۵۱)۔ غرضیکہ اُن کے ہاں 'قرآنِ کریم کی تمام آیات کا مفہوم اسی طرح (تاویل کی رُو سے) متعیّن کیا جاتا ہے اور یہ تاویلات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

اسماعیلی (اور دیگر شیعہ فرقوں) کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور مرکز' **امام** کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

امامت

آنحضرتؐ کے دادا' مولانا عبدالمطلب حضرت ابراہیمؑ کی ذُرّیت سے ہیں ۔ آپ بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت عیسٰیؑ کے دَور میں مستقر امام تھے۔ یعنی آپ میں نبوّت ، رسالت ' وصایت اور امامت ' چاروں مراتب جمع تھے ۔ آپ نے اپنے دو فرزندان ' مولانا عبداللہ اور مولانا ابو طالب کو خدا کے امر و وحی سے الگ الگ رتبے دیئے ۔ پہلے کو نبوّت و رسالت کے رتبے دے کر ظاہری دعوت کا صدر بنایا اور دوسرے کو وصایت و امامت کا درجہ دے کر باطنی دعوت کا رئیس مقرر کیا۔ مولانا ابو طالب نے نبوّت و رسالت کا رتبہ آنحضرتؐ کو اور وصایت و امامت کا درجہ مولانا علیؓ کو دیا۔ مولانا ابوطالب کی شانِ عظمت و جلالت اس سے ظاہر ہے کہ آپ میں بھی مولانا عبدالمطلب کی طرح چاروں مراتب جمع ہو گئے تھے .... آپ کے بعد ہی چاروں مراتب مولانا علیؓ کی ذات میں جمع ہیں۔ (صہ ۶۲ ۔ ۶۳)۔ چنانچہ مستقر امام ' مولانا علیؓ ہی ہیں جن پر دلالت کرنے کے لئے آنحضرتؐ بھیجے گئے تھے ...... آپ نے جو آخری رسالت بہم پہنچائی وہ مولانا علیؓ کی ولایت ہے۔ گویا آپؐ کے مبعوث ہونے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ باطنی شرک کو مٹائیں (اور باطنی شرک یہ ہے کہ) دنیا میں کوئی مشرک نہیں۔ سب خدا کو واحد مانتے ہیں۔ اگر لوگ شرک کرتے ہیں تو مولانا علیؓ کی ولائیت میں شرک کرتے ہیں۔ (صہ ۳۶۰)

امام کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ :-

اگر تو اپنی آنکھوں سے امام کو زنا کرتے ' شراب پیتے اور فواحش کا مرتکب ہوتا دیکھے تو اسے

---

[1] معاذاللہ ، ثم معاذاللہ۔

اپنے دل و زبان سے منکر نہ سمجھ اور اس کے درست اور حق ہونے میں کچھ شک نہ کر، کیونکہ اللہ تعالے نے ائمہ کو اس سے بچالیا ہے۔ (۳۶۳)

بلکہ یہاں تک کہ :۔

ہمارے ائمہ معصومین کی شان انبیائے مرسلین کی شان سے بدرجہا بلند ہے۔ دونوں میں مالک اور مملوک کا فرق ہے۔ ائمہ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوسکتا بخلاف انبیائے مرسلین کے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ان انبیاء مرسلین میں موسےؑ تو ایک طرف آنحضرتؐ تک شامل ہیں[1] (۳۶۶)

آغاخانی اور بوہرے

ہندوستان میں، اسماعیلی، خوجوں (آغاخانیوں) اور بوہروں پر مشتمل ہیں۔ ان کے عقاید اور بھی عجیب و غریب ہیں جنہیں ہم، میرزا محمد سعید دہلوی (مرحوم) کی کتاب " مذہب اور باطنی تعلیم " کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

ادوار سابقہ میں جب حضرت علیؓ دشنو تھے تو حضرت محمدؐ نے ویدویاس کا قالب اختیار کیا۔ جب حضرت علیؓ اپنی معروف عام حیثیت میں نمودار ہوئے تو وہ وشنو کا دسواں اوتار (نشی کلنکی) تھے ...... بعض خوجے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نعوذ باللہ خدا، اور سیدنا محمدؐ ان کے پیغمبر تھے۔ موجودہ آغاخان تک تمام نزاری[2] ائمہ، حضرت علیؓ کا اوتار تصوّر کئے جاتے ہیں اور اس طرح انہیں بھی وہی مرتبۂ الوہیت حاصل ہے جو حضرت علیؓ کو حاصل تھا۔ خوجے اور شمسی ہندو انہیں اپنا معبود تصوّر کرتے ہیں .... یہ لوگ آواگون یا تناسخ کے بھی قائل ہیں اور قیامت، جنّت، دوزخ کے بھی ـــــ قرآنِ مجید کو یہ سب سے آخری اور مستند وید خیال کرتے ہیں لیکن جو قرآن اس وقت ملّتِ اسلامی کے درمیان ہے اس کو وہ مستند نہیں مانتے......... نزاریہ فرقہ کا عموماً مسلک یہ رہا ہے کہ وہ جس ملک میں سکونت پذیر ہوتے ہیں، اس ملک کی شریعت اختیار کرلیتے ہیں۔ مثلاً ترکستان میں وہ حنفی فقہ کے مقلّد ہیں اور ایران میں اثنا عشری فقہ کے پابند۔ (صہ ۳۲۲. ۳۲۹)

---

[1] معاذ اللہ۔

[2] اسماعیلیوں کا سب سے زیادہ مشہور فرقہ نزاری ہے جس کا ایک امام حسن بن صباح تھا باطنی فدائی اس کے معتقدین کہلاتے تھے۔ آغاخانیوں اور بوہروں کا تعلق اسی فرقہ سے ہے۔

یہ ہیں مختصراً، شیعوں کے ایک اہم فرقہ 'اسماعیلی کے عقائد.

اس کے بعد آپ، ان کے دوسرے فرقہ امامیہ (اثنا عشری) کی طرف آیئے. جیسا کہ کہا جا چکا ہے، شیعہ حضرات کا بنیادی عقیدہ امامت ہے. امامت کے متعلق اس فرقہ کے عقائد کیا ہیں، اسے ہم اس کتاب سے (براہِ راست) پیش کرتے ہیں جو اس فرقہ کے نزدیک مذہب کے ستون کی حیثیت رکھتی ہے. یعنی کلینی کی کتاب الکافی. یہ ان حضرات کے نزدیک حدیث کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب ہے اور اس کی ہر حدیث، کسی نہ کسی امام سے مروی ہے. کتاب کا پورا نام ہے 'الاصول الکافی' اور تالیف ہے، ثقتہ الاسلام محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی الرازی (متوفی ۳۲۹ھ) کی. ہمارے سامنے اس کتاب کا عربی نسخہ وہ ہے جو مطبع الحیدری، طہران میں چھپا تھا اور جسے دارالکتب اسلامیہ، طہران نے شائع کیا تھا. اُردو ترجمہ "حضرت ادیبِ اعظم' مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی" کا ہے جسے شمیم بک ڈپو، ناظم آباد کراچی نے کتاب الشافی کے نام سے (۱۹۶۶ء میں) شائع کیا ہے[1]. اس میں امامت کے خصائص ولزوم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے مختصراً درجِ ذیل کیا جاتا ہے.

امامیہ یا اثنا عشری

اصول الکافی

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ خدا سے براہِ راست علم ملنے کا نام وحی ہے اور وحی کا سلسلہ نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا. آپؐ کی طرف نازل شدہ وحی، قرآن کے اندر درج ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے. ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں سند اور حجت قرآنِ مجید ہے اور اب کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے کوئی بات (جو قرآن سے باہر ہو) یہ کہہ کر منوائے کہ وہ خدا کا حکم ہے. خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا خاصۂ نبوت تھا لیکن ہم اصول الکافی میں دیکھتے ہیں کہ اس میں امامت کو بھی شریک کر لیا گیا ہے، اگرچہ اس کے لئے اصطلاح نبی کی نہیں اختیار کی گئی' ایک اور اختیار کی گئی ہے. وہ اصطلاح ہے مُحَدَّث کی. (د کے زبر کے ساتھ). الکافی میں ہے.

مُحدَّث کا عقیدہ

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے آیہ "کَانَ رَسُوْلاً نَّبِیًّا" کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے. فرمایا. نبی وہ ہے

---

[1] اصولِ کافی کا دوسرا حصہ "فروعِ کافی" ہے. اس کا اُردو ترجمہ بھی مولانا ظفر حسن صاحب کے قلم سے شمیم بکڈپو نے شائع کیا ہے.

جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے. اس کی آواز سنتا ہے لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے، خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی. میں نے پوچھا. امام کی منزلت کیا ہے. فرمایا. وہ فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں. پھر یہ آیت پڑھی. وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَ لَا مُحَدَّثٍ. (الشافی، جلد اوّل صہ ۲۰۳)

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھتے جایئے کہ اس روایت میں جو آیت لکھی گئی ہے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ)۔(۲۲/۵۲) قرآنِ کریم میں، اس آیت میں "وَ لَا مُحَدَّثٍ" کے الفاظ نہیں ہیں. اصولِ کافی (عربی) میں اس روایت کے نیچے حاشیہ میں لکھا ہے." ولا محدث" انما هو قرأة اهل البيت عليهم السلام. (جلد اوّل صہ ۱۷۶) "اہلِ بیت کی قرأت قرآن میں اس آیت میں "وَلَا مُحَدَّثٍ" کے الفاظ آئے ہیں." یہ بات آپ کے لئے وجہ تعجب نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ (جیساکہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے)، بیشمار آیات ایسی ہیں جن کے متعلق (الکافی میں) کہا گیا ہے کہ جبرئیل امین تو انھیں اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے لیکن مروّجہ قرآن میں، یہ الفاظ نہیں ہیں. اس وقت ہم مُحدّث کے نظریہ سے بحث پر اکتفا کرتے ہیں. یعنی مُحدّث وہ ہے جس کی طرف فرشتے پیغامِ خداوندی لے کر نازل ہوتے ہیں. وہ ان کا کلام سنتا ہے لیکن انھیں دیکھ نہیں سکتا. اس سے اگلی روایت میں ہے.

"مُحدّث وہ ہے جو ملائکہ سے ہمکلام ہوتا ہے، ان کا کلام سنتا ہے لیکن انھیں دیکھتا نہیں اور نہ خواب نظر آتا ہے." (الشافی، جلد اوّل صہ ۲۰۴)

ازاں بعد، ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "میں اور میرے صلب سے گیارہ امام محدّث ہیں."
(الشافی، جلد اوّل، صہ ۲۸۱)

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک خدا سے براہِ راست (بذریعہ ملائکہ) علم حاصل کرنے کا تعلق ہے، رسولؐ اور محدّث میں کوئی فرق نہیں. اس کی تصریح الکافی کی دیگر روایات میں بھی موجود ہے.

اس میں اور نبوّت میں عملاً کوئی فرق نہیں

(مثلاً) قرآنِ کریم میں نبیِ اکرمؐ کے متعلق خدا نے فرمایا کہ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۷/۵۹) "جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو، جس سے وہ روکے، اس سے رُک جاؤ."[1]

---

[1] اس آیت کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں.

کافی کی ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا مَا جَاءَ بِہٖ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَامُ اٰخُذُ بِہٖ وَمَا نَھٰی عَنْہُ اَنْتَھِیْ ـــ "جو کچھ (حضرت) علیؑ نے فرمایا اس کو لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہو۔" (شافی جلد اوّل صہ ۲۲۵) یہ اس لئے کہ جَرٰی لَہٗ مِنَ الْفَضْلِ مِثْلَ مَا جَرٰی لِمُحَمَّدٍ۔ (شافی جلد اوّل صہ ۲۲۵)، عربی، الکافی جلد اوّل صہ ۱۹۷) یعنی، فضلِ خداوندی میں سے (حضرت) علیؑ کے لئے بھی وہی کچھ جاری ہوا تھا، جو رسولؐ اللہ کے لئے جاری ہوا تھا، یعنی دونوں کا سرچشمۂ علم ایک ہی تھا۔ اس کے بعد ہے:۔

امیر المومنینؑ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ میں اللہ کی طرف سے جنّت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ میں فاروقِ اکبر ہوں۔ میں صاحبِ اعصا یعنی اجتماعِ مسلین کا سبب ہوں۔ میں صاحبِ میسم یعنی وہ آیات ہوں جو دلیلِ امامت ہوں۔ میری وصایت (وصی ہونے) کا اقرار کیا ہے تمام ملائکہ، روح اور مرسلین نے جس طرح اقرار کیا ہے محمد صلعم کے متعلق اور سوار کیا گیا ہوں منصبِ امامت پر۔ جیسے آں حضرتؐ (نبوّت پر) .... اور یہ منصب ہمارا خدا کی طرف سے ہے۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۲۲۵)

ایک اور روایت میں ہے:

امام اپنے زمانہ میں واحد و یگانہ ہوتا ہے۔ کوئی، فضل و کمال میں اس کے نزدیک بھی نہیں ہوتا اور نہ کوئی عالم اس کے مقابلہ کا ہوتا ہے۔ نہ اس کا بدل پایا جاتا ہے نہ اس کا مثل و نظیر۔ وہ بغیر اکتساب اور خدا سے طلب کے ساتھ ہر قسم کی فضیلت سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اختصاص اس کے لئے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔

(شافی، جلد اوّل صہ ۲۳۱)

اس کے بعد، امام کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آلِ رسول میں سے، "نسلِ سیدہ طاہرہ معصومہ سے ہوتا ہے۔" (ایضاً صہ ۲۳۳)" انبیاء اور ائمہ علیہم السلام موفق من اللہ ہوتے ہیں اور علم و حکمتِ الٰہیہ کے خزانہ سے وہ چیز ان کو دی جاتی ہے جو ان کے غیر کو نہیں دی جاتی۔" (ایضاً صہ ۲۲۴)۔ ایک روایت میں بات اور بھی واضح ہوگئی ہے۔ فرمایا امام جعفر صادقؒ نے کہ:۔

اس (امام) کا علم اس وسیلہ سے .... جو آسمان تک کھچا ہوا ہے تاکہ وحیٔ الٰہی کا سلسلہ قطع نہ ہو اور جو احکام من اللہ ہیں وہ نہیں حاصل ہوتے مگر بوسیلۂ امام اور خدا اپنے بندوں کے اعمال

کو قبول نہیں کرتا جب تک معرفتِ امام نہ ہو۔ ...... امام خدا کا منتخب اور پسندیدہ ہوتا ہے، برگزیدہ اور مقبولِ خدا و رسول ہے اور ایسا ہادی ہے جو محلِ اسرار الٰہیہ ہے...... (خدا نے) خلق کے پیدا کرنے سے پہلے ان (ائمہ) کو پیدا کیا۔ (ایضاً صہ ۳۶ - ۲۳۵)

آپ نے غور فرمایا کہ نبی اور محدّث میں لفظی تغیّر کے سوا کوئی فرق نہیں۔ یہ عقیدہ کہ ختمِ نبوّت کے بعد بھی خدا انسانوں سے ہمکلام ہوتا ہے، (یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہو سکتا ہے) ازاں بعد کس کس شکل میں نمودار ہوتا رہا، اس نے کس طرح نبوّت کے بند کئے ہوئے دروازہ کو چوپٹ کھول دیا اور اس دروازے سے کون کون، کس کس انداز سے، داخل ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں، اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔ سرِدست آپ امام کی مزید خصوصیات ملاحظہ فرمایئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم وہ ...... ہیں جن پر اللہ نے اپنی اطاعت فرض کی ہے[1]۔ لوگوں کو بدون ہماری معرفت کے چارہ نہیں اور ہم سے جاہل رہنا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا وہ مومن ہے اور جس نے انکار کیا[2] وہ کافر ہے اور جس نے ہم کو نہ پہچانا لیکن انکار نہ کیا وہ گمراہ ہے؛ جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعتِ واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے.... فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے۔ ہماری محبت ایمان ہے اور ہمارا بغض کفر...... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۱۶ - ۲۱۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے، امیر المومنین (یعنی حضرت علیؓ) کے متعلق فرمایا کہ:

رسول اللہ کے بعد، مثلِ رسول ...... ان کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور ان پر تقدم کرنے والا ایسا ہے جیسے خدا اور رسول پر سبقت کی...... اور ان پر فضیلت چاہنے والا ایسا ہے جیسے رسول ...... پر فضیلت چاہی اور چھوٹے یا بڑے حکم کو ان کے نہ ماننا شرک باللہ ہے۔ رسول اللہ وہ باب اللہ تھے جس میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔ وہ ایک راستہ تھے، جو اس پر چلا وہ اللہ سے مل گیا اور

---

[1] الشافی کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ الکافی کے الفاظ ہیں نحن الذین فرض اللہ طاعتنا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ "ہم وہ لوگ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے"۔

[2] ہم نے پہلے لکھا ہے کہ معرفتِ امام کفر و امتیاز کا خطِ امتیاز قرار پا گئی۔ اس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی امیر المومنین تھے۔ ان کے بعد اور یکے بعد دیگرے تمام ائمہ کے لئے یہی صورت رہی۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۲۴۷)

مسلمانوں میں قرآنِ کریم ہی دین میں سند و حجت تھی (اور ہے)۔ اس کے متعلق امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ:

کسی کی یہ طاقت نہیں کہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس ظاہر و باطنِ قرآن کا پورا پورا علم ہے سوائے اوصیائے علیہ السلام کے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۲۶۱)

یہاں ظاہر کے ساتھ باطن کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔ ائمہ کے علم کے متعلق عقیدہ ہے کہ ان کا علم رسول اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی علم کی ابتداء رسول اللہ سے ہوئی تھی، انتہا ائمہ پر۔ الکافی میں ہے:

راوی کہتا ہے، میں نے ابو جعفر علیہ السلام کو کہتے سنا، اگر ہمارا علم زیادہ نہ ہوتا رہتا تو البتہ ہم اسے ختم کر دیتے۔ میں نے کہا، کیا ایسا علم بھی آپ کو حاصل ہوتا ہے جو رسول اللہ کو نہ ہو۔ فرمایا صورت یہ ہے، پہلے رسولؐ پر پیش ہوتا ہے، پھر ائمہؑ پر اور پھر منتہی ہوتا ہے ہماری طرف۔ (شافی، جلد اوّل صہ ۲۹۱)

وحی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ چونکہ یہ علم اکتسابی نہیں ہوتا اس لئے اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ رسول جب چاہتا اس پر وحی آجاتی۔ وحی کا نزول خدا کی مشیّت پر موقوف ہوتا تھا۔ وہ جب چاہتا اور جو چاہتا رسول کو بذریعہ وحی بتا دیتا۔ اس کے برعکس ائمہ کے متعلق ہے:

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے۔ امام جب چاہتا ہے کہ جانے تو اس کو علم دے دیا جاتا ہے۔

(شافی، جلد اوّل صہ ۲۹۵)

غیب کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ اس کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ البتہ خدا جس بات کا علم چاہے حضرات انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی دے دیتا تھا۔ ائمہ کی علمِ غیب کے متعلق یہ کیفیت تھی کہ

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ جو امام یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا مصیبت پہنچے گی اور انجام کار کیا ہوگا، تو وہ مخلوقِ خدا کی راہ نمائی نہیں کر سکتا اور خدا کی حجت نہیں ہو سکتا۔ (شافی صہ ۲۹۵)

عیسائیت کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسےٰؑ نے اپنی جان دے کر، گناہگاروں کو بخشوا لیا، یعنی ان کا خون گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ الکافی کی ایک روایت میں ہے کہ

امام موسےٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالےٰ غضب ناک ہوا ہمارے شیعوں پر (بہ سببِ ترکِ تقیہ) پس

اختیار دیا مجھے اپنے اور ان کے قتل ہونے کے درمیان۔ پس میں نے اپنی جان دے کر ان کو بچا لیا۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۲۹۷)

ایک اور روایت میں ہے:۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا نہیں حیا کرتا عذاب دینے سے اس گروہ کے جو عبادت کرے تحت ولایت و محبتِ امام جابر۔ چاہے اس کے اعمال کتنے ہی نیک ہوں اور حیا کرتا ہے عذاب دینے میں اس گروہ کو جو عبادت کرے امام منصوص من اللہ کی محبت کے ساتھ چاہے اس کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں۔

(شافی، جلد اوّل صہ ۴۶۲)

نجات و سعادت کا یہی مدار ہے، کفر و ایمان کا یہی معیار ہے۔

ابو حمزہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا۔ علی وہ دروازہ ہیں جس کو اللہ نے کھولا ہے۔ جو اس میں داخل ہوا وہ مومن ہے اور جو اس سے خارج ہوا وہ کافر ہے اور جو نہ داخل ہوا نہ خارج ہوا وہ اس طبقہ میں ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اس کے لئے میری مشیّت ہے۔ (چاہے بخشوں چاہے نہ بخشوں) (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۴۱)

ان ائمہ کی معرفت اُمتِ محمدیہ ہی پر لازم نہیں تھی، انبیاء سابقہ کی وساطت سے بھی ان کی پہچان کرادی گئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ

فرمایا امام رضا علیہ السلام نے کہ تمام صحفِ انبیاء میں ولایت علیؓ کا ذکر تھا۔ خدا نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جو نبوّتِ محمدؐ اور وصایتِ علیؓ کا مُقِر نہ ہو۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۴۱-۵۴۲)

حضرت علیؓ کی فضیلت کا ذکر آگیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں، موجودہ شیعہ حضرات کے عقاید کی بھی دو ایک مثالیں پیش خدمت کر دی جائیں۔ لاہور سے (شیعہ حضرات کا) ایک ماہ نامہ شائع ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کا مقام

معارفِ اسلام — وہ ہر سال، بالعموم ستمبر۔ اکتوبر میں، اپنا ایک خاص نمبر شائع کرتے ہیں جس کا عنوان ہوتا ہے۔ علیؓ و فاطمہؓ نمبر۔ اس رسالہ کی اشاعت بابت ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں علامہ مجلسیؒ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے جس میں آپ نے فرمایا:۔

میں خدا کے اسمائے حسنیٰ، امثالِ علیا اور آیاتِ کبریٰ ہوں اور میں ہی جنت اور دوزخ کا مالک ہوں۔

میں اہلِ جنّت کو جنّت میں داخل کروں گا اور اہلِ نار کو جہنّم میں ڈالوں گا اور میں ہی اہلِ جنّت کی تزویج کروں گا اور میرے ہی ذمّہ اہلِ جہنّم کا عذاب کرنا ہے اور میرے ہی طرف ساری مخلوق کی بازگشت ہوگی اور میں ہی مرکز ہوں، میری ہی طرف ہر ایک شئے بعد قضاء الٰہی رجوع کرتی ہے اور میرے ہی ذمّہ ساری مخلوقِ خدا کا حساب ہے۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کے وقت احتجاج و اتمام حجّت کیا اور میں ہی روزِ قیامت ان کا شاہد ہوں اور میں ہی وہ ہوں جس کے پاس کل مخلوق کی موت اور مصائب اور فیصلہ جات کا علم ہے اور جُملہ آیات و معجزات وکتبِ انبیاءً علیہم السلام میرے سپرد کی گئی ہیں اور ان کا محافظ ہوں اور میں لاٹھی والا اور نشان والا ہوں اور میں ہی ہوں جس کے لئے بادل، گرج، بجلی، تاریکیاں، روشنیاں، ہوائیں، پہاڑ، سمندر، ستارے، سورج اور چاند مسخّر کر دیئے گئے ہیں اور میں ہی وہ ہوں جس نے اس علم کے ذریعہ جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے گن کر احصار کیا ہوا ہے اور میں رازِ قدرت کے ذریعہ جو اللہ نے محمّد کو عطا فرمایا اور محمّد نے مجھے پہنچایا ہے اور میں ہی ہوں جس کو خدا نے اپنا نام، اپنا کلمہ، اپنی حکمت، اپنی فہم عطا فرمایا ہے۔ اے معاشر النّاس۔ پوچھ مجھ سے قبل اس کے کہ مجھ کو نہ پاؤ۔ خداوندا! میں تجھ کو اپنا گواہ بناتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ العلی العظیم۔ (صہ ۶۱ــ۶۰)

اسی رسالہ کی ستمبر ۱۹۷۱ئ کی اشاعت میں تحریر ہے۔

اگر جناب مولا علیؑ نہ ہوتے تو جناب رسولِ خداؐ پیدا نہ ہو سکتے اور جناب رسولِ خداؐ پیدا نہ ہوتے تو لو لاک لما خلقت الافلاک، زمین و آسمان پیدا نہ ہوتے۔ لہذا، علیؑ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ (صہ)

اسی رسالہ کی نومبر ۱۹۶۷ئ کی اشاعت میں ہے:۔

قربان جائیں اس مظہر العجائب والغرائب اسد اللہ الغالبؑ کے کہ جب اس نے توراتِ موسیٰؑ میں ظہور فرمایا تو خدا کا منہ اور خدا کا کلام بن گیا۔ جب وہ زبور میں جلوہ افروز ہوا تو تحمید و تمجید کا لباس اوڑھ کر لحنِ داؤدؑ بن گیا۔ جب اس کی تجلّیات غزل الغزلات میں ظاہر ہوئیں تو تقدیس و عبودیّت کی دعاؤں میں سلیمانؑ کا لہجہ بن گیا۔ جب وہ انجیلِ عیسیٰؑ میں نور بار ہوا تو مددگار اور طفلِ معصوم

بن گیا۔ جب وہ صحیفۂ یوحنا میں ضیا پاشں ہوا تو اسپ سفید پر سوار ہو کر شیر کی آواز میں آیاتِ حمد پڑھنے لگا۔ جب وہ قرآنِ حمید میں روشن ہوا تو جگہ جگہ اس کا ذکر، جگہ جگہ اس کی فضیلت، جگہ جگہ اس کی مدحت، جگہ جگہ اس کی شجاعت، جگہ جگہ اس کی کرامت۔ کبھی وہ یدُ اللہ کی صورت میں خدا کا ہاتھ، کبھی وہ لِسَانٌ صِدْقًا نَبِیًّا کی صورت میں رسولوں کی سچی زبان۔ (صہ ۹۱)

اسی تسلسل میں آگے لکھا ہے:۔

ذرا اور آگے چلئے .... یہ بے مثال و بے نظیر امامِ اوّل زرتشت کے ژند و پاژند میں پہنچا تو شعلۂ جوّالہ کی صورت میں، جین مت میں گیا تو شانتی اور اہنسا کی صورت میں، ویدوں میں اس نے رُوپ دھارا تو اُوم کی صورت میں۔ شاستروں میں سرُوپ دکھایا تو پرم آتما کی صورت میں۔ گیانوں میں قدم رکھا تو مہابلی کی صورت میں۔ گیتا میں جلوہ ریز ہوا تو نارائن کی صورت میں۔ رامائن میں ضو فشاں ہوا تو مہاتم کی صورت میں اور دیوتاؤں کو نظر آیا تو سنگھ کی صورت میں۔ سنگھ! شیر!! اسد!!! لائن ــــ اسی سنگھ کی، اسی شیر کی، ہزارہا سال سے مندروں، شوالوں میں پرستش کی جارہی ہے۔ کرشن جی کو جب چودہ معصوموں کے چودہ صفاتی روپ نظر آتے تھے، ایک روپ میں سنگھ یعنی شیر بھی دکھائی دیتا تھا۔ (صہ ۹۲ - ۹۱)

یہ ہیں دو چار مثالیں ان عقائد کی جو حضرت علیؓ کی فضیلت کے سلسلہ میں شیعہ حضرات میں رائج ہیں اور اس کا تو غالباً آپ کو علم ہی ہوگا کہ ان حضرات کا کلمہ اس طرح مکمل ہوتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ علیٌ ولی اللہ۔ (معارفِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صہ ۱۴۱)

آپ نے دیکھا کہ محدّث کے عقیدہ سے شروع ہو کر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کہ جب نجات و سعادت ائمہ منصوص کی اطاعت، بلکہ معرفت کے ساتھ مشروط ہو گئی تو پھر نہ (براہِ راست) قرآنِ کریم کی کوئی حیثیت باقی رہی نہ ختمِ نبوّت کی کوئی اہمیت۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے

موجودہ قرآن محرّف ہے

ساتھ ہی ایسے عقائد بھی عام کئے گئے ہیں جن سے قرآن کی محفوظیّت اور ابدیّت ہی باقی نہ رہی۔ چنانچہ الکافی کے باب (کتاب الحجت)

میں متعدد آیات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح ہے۔" ہم یہاں اس کی دو چار مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

عن ابي عبد الله عليه السلام في قوله تعالىٰ لقد عهدنا الى آدم من قبل كلمات في محمد وعلي وفاطمه والحسن والحسين و الائمة عليهم السلام من ذريتهم فنسي۔ هكذا والله نزلت على محمد۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ لقد عہدنا کے متعلق فرمایا کہ وہ کلمات تھے محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسن و حسین اور ان ائمہ کے متعلق جو ان کی ذریت سے ہونے والے تھے۔ آدم ان کو بھول گئے۔ واللہ۔ محمدؐ پر یونہی نزولِ آیت ہوا۔ (شافی، صہ ۵۱۳)

قرآنِ مجید میں یہ آیت اس طرح ہے۔

وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (۲۰/۱۱۵)

ایک روایت میں ہے۔

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے، آیت (فستعلمون من هو في ضلال مبين ....) "عنقریب تم جان لوگے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے۔ اے جھوٹوں کے گروہ۔ تم کو میں نے ولایتِ علی کی اپنے بعد آنے کی خبر دے دی تھی۔ اب کھلی گمراہی میں کون ہے۔" کے متعلق فرمایا کہ یہ آیت اس مضمون کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۷)

قرآنِ کریم میں صرف اتنا ہے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۶۷/۲۹)

ایک روایت میں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی کہ "جب ایک سائل نے سوال کیا ایسے عذاب کا جو واقعہ ہونے والا تھا (ولایتِ علیؑ کے) منکروں پر اور جس کا کوئی دفع کرنے والا نہ تھا۔" امام نے فرمایا، واللہ! رسولؐ پر یہ اس طرح (یعنی بولایتِ علی کے ساتھ) نازل ہوئی تھی۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۸)

قرآنِ مجید میں یہ آیات اس طرح ہیں۔

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لا لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ۔ (۷۰/۱-۲)

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس قسم کی آیات میں جو الفاظ خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے لیکن اب قرآن میں نہیں ہیں، وہ کس طرح حذف (گم) ہو گئے۔ اس کے متعلق

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جبریل حضرت رسولِ خدا پر یہ آیت اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے "جن لوگوں نے (آلِ محمدؐ کا حق غصب کیا) انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایک دوسری بات سے۔ پس ہم نے ان لوگوں پر (جنھوں نے آلِ محمدؐ کا) حق لے لیا تھا، آسمان سے اس لئے عذاب نازل کیا کہ وہ بدکار تھے۔ (شافی، صہ ۵۲۰)

قرآن کی آیت یوں ہے:

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ (۲/۵۹)

قرآنِ کریم کی خصوصیتِ کبریٰ، اساسی اہمیت اور انفرادیت اس میں ہے کہ یہ خدا کی آخری، مکمل اور غیر متبدل کتاب ہے اور ایسی محفوظ کہ اس میں ایک حرف کی بھی نہ کمی بیشی ہوئی ہے (نہ ہو سکتی ہے) اور نہ ہی ردّ و بدل کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے۔ (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (۱۵/۹)۔ اس کا ارشاد ہے) اگر اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ شک پیدا ہو جائے کہ یہ اصلی ہے یا نہیں، تو اس پر ایمان کی بنیاد متزلزل ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت انبیاء سابقہ کی طرف نازل شدہ محرّف کتابوں (تورات، انجیل) کی سی رہ جاتی ہے۔ جو مثالیں ہم نے اوپر پیش کی ہیں (اور اس قسم کی متعدد اور آیات بھی الکافی میں درج ہیں) ان کی رُو سے قرآن کی محفوظیت اور ابدیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن کے باطنی معانی جن آیات کے متعلق کہا کہ ان میں ردّ و بدل نہیں ہوا، ان کے معانی ایسے بیان کئے گئے جن کی سند قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔ ان معانی کی بنیاد

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ علی کے بارے میں جو نازل کیا گیا تھا سرکشی سے لوگوں نے اس سے انکار (کفر) کیا۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۳)

دوسری روایت میں ہے کہ قرآنِ کریم میں تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔

(ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق) ائمہ کا وہ علم ہے جو انہیں خدا سے حاصل ہوتا تھا۔ اسے تاویل کہا جاتا ہے۔
(تاویل اور قرآن کے باطنی معانی کے متعلق تفصیلی ذکر اسماعیلیہ کے عقائد کے ضمن میں آچکا ہے) مثلاً قرآن کریم کی آیت عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ۔ (۷۸/۱-۲) "تم سے پوچھتے ہیں نبار العظیم کے متعلق" کے معانی کے سلسلہ میں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ نبأ عظیم سے مراد ولایت ہے۔ (راوی نے سوال کیا۔ کیا ولایت خدا مراد نہیں۔ فرمایا ولایتِ امیر المومنین مراد ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۴)

اسی طرح آیت وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ج (۱۰/۱۰۵) کے متعلق۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے مراد ولایت ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۵)

یہاں تک بات موجودہ قرآن میں تحریف اور اس کے معانی میں تاویل کی ہو رہی تھی لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کافی (کتاب الحجۃ) کے انتالیسویں باب کی دو روایات میں دیکھئے جن کا مکمل ترجمہ درجِ ذیل ہے۔

ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کی۔ میں آپ پر فدا ہوں۔ آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرا کوئی کلام سُن تو نہیں رہا۔ حضرت نے وہ پردہ اٹھایا جو اس مکان اور دوسرے کمرے کے درمیان تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ حضرت نے فرمایا، اب جو تمہارا دل چاہے پوچھو۔ میں نے کہا، میں آپ پر فدا ہوں۔ آپ کے شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ایک باب علم کا تعلیم دیا جس سے ہزار باب علم کے آپ پر اور منکشف ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا، اے ابو محمد (کنیت ابو بصیر) رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ہزار باب علم کے تعلیم کئے اور ان پر ہر باب سے ہزار باب اور ظاہر ہوئے۔ میں نے کہا واللہ، علم اس کا نام ہے۔

قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے

پس حضرت کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا، اے ابو محمد! ہمارے پاس جامع ہے۔ لوگ کیا جانیں جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا حضور بتائیں جامعہ کیا ہے۔ فرمایا، وہ ایک صحیفہ ہے ستّر ہاتھ لمبا رسول اللہؐ کے ہاتھ سے اور رسول اللہؐ نے اس کو اپنے دہنِ مبارک سے .... بیان فرمایا اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے اس کو لکھا۔ اس میں تمام حلال و حرام کا ذکر ہے اور ہر اس شے کا جس کی

احتیاج لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہلکے سے خراش کی دیت کا بھی ذکر ہے۔ پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے اوپر رکھا اور فرمایا، اے ابو محمد! مجھے اجازت ہے۔ میں نے کہا، میں آپ پر فدا ہوں۔ میں آپ کا ہوں جو چاہے کیجئے۔ حضرت نے اپنی دو انگلیوں سے چٹکی لے کر فرمایا، اس کی دیت کا بھی ذکر ہے۔ یہ آپ نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ میں نے کہا، واللہ علم یہ ہے۔ حضرت نے فرمایا، صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا۔ ہمارے پاس جفر بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں جفر کیا ہے؟ میں نے پوچھا حضور جفر کیا ہے۔ فرمایا وہ ایک ظرف ہے آدم کے وقت سے جس میں انبیاء اور اوصیاء کے علم کا ذکر ہے اور ان تمام علماء کے علم کا جو بنی اسرائیل میں ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا، بس علم تو یہی ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا، ہمارے پاس مصحفِ فاطمہؑ بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ کیا ہے۔ میں نے کہا وہ کیا ہے۔ فرمایا، تمہارے اس قرآن سے (بلحاظ تفصیل و توضیحِ احکام) وہ مصحف تین گنا زیادہ ہے۔ تمہارے قرآن میں ایک حرف ہے یعنی اجمال ہے۔ میں نے کہا، واللہ علم یہ ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں۔ پھر خاموش رہ کر فرمایا۔ ہمارے پاس علم ماکان و مایکون ہے قیامت تک کے واقعات کا۔ میں نے کہا۔ واللہ علم اس کو کہتے ہیں۔ فرمایا، ہاں اس کے علاوہ بھی ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا ہے۔ فرمایا، جو حادثے رات اور دن میں ہوتے ہیں اور جو ایک امر دوسرے کے بعد اور ایک شے دوسری شے کے بعد دنیا میں ہوتی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی، ہمیں اس کا بھی علم ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سُنا کہ ۱۲۸ ہجری میں فلاسفہ (بعہدِ بنی عباس) ظاہر ہوں گے (جو منکرِ اسلام و توحید ہوں گے) میں نے یہ مصحفِ فاطمہؑ میں دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا، مصحفِ فاطمہ کیا ہے۔ فرمایا جب رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا تو جنابِ فاطمہؑ پر ہجومِ اندوہ وغم ہوا، ایسا کہ جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خدا نے ان کے پاس اس غم میں تسلّی دینے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا جس نے ان سے کلام کیا۔ حضرت فاطمہؑ نے یہ واقعہ امیر المومنین سے بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ اب جب فرشتہ آئے اور تم اس کی آواز سنو تو مجھے بتانا چنانچہ جب پھر فرشتہ آیا تو حضرت فاطمہ نے آگاہ کیا۔ امیر المومنین علیہ السلام فرشتے کی تمام باتوں کو لکھتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ باتیں اس مصحف میں لکھی گئیں۔ پھر فرمایا اس میں حلال و حرام کا ذکر نہیں بلکہ آئندہ

ہونے والے واقعات کا ذکر ہے۔ (الشافی، جلد اوّل، صہ ۲۷۲ - ۲۷۰)

یہاں آخر میں کہا گیا ہے کہ اس میں حرام و حلال کا ذکر نہیں لیکن اس کے دو ہی تین روایتوں کے بعد ایک روایت میں ہے۔

> راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سُنا کہ ہمارے پاس وہ چیز ہے کہ ہم اس کی وجہ سے لوگوں کے محتاج نہیں بلکہ لوگ ہمارے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس کو رسول اللہ نے لکھوایا اور حضرت (علیؓ) نے لکھا۔ اس میں حلال و حرام کا ذکر ہے۔ ہم جانتے ہیں اس اَمر کو جسے تم شروع کرتے ہو اور جانتے ہیں جب تم ختم کرتے ہو۔
>
> (شافی، جلد اوّل، صہ ۲۷۴ - ۲۷۳)

خدا کی طرف سے یہ تمام احکام ملائکہ لے کر نازل ہوتے تھے۔ ملائکہ ائمہ حضرات کے گھروں میں کس انداز سے آتے تھے، اس کے متعلق

> ابو حمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ میں حضرت علی بن الحسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر مجھے باہر رُکنا پڑا۔ پھر میں اندر داخل ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کوئی چیز چُن رہے ہیں اور پردہ کے اندر ہاتھ سے ان کو دے رہے ہیں جو گھر میں ہے۔ میں نے کہا یہ کیا چیز آپ چن رہے ہیں۔ فرمایا یہ ملائکہ کے پروں کے ریشے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد جب ہم خلوت میں ہوتے ہیں تو ان کو جمع کر کے اطفال کے لئے تعویذ بناتے ہیں۔ میں نے کہا حضور کیا وہ آپ کے پاس آتے ہیں؟ فرمایا کہ ہم اپنے تکیوں سے حرکت کر نہیں پاتے کہ وہ آجاتے ہیں۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۴۸۵)

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ ہرمزان نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ہم لوگ تم (عربوں) سے شکست اس لئے کھا گئے ہیں کہ تمہارے پاس خدا کی کتاب ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم، تم پر کبھی غالب نہیں آسکتے ___ دنیا کی کوئی قوم بھی تم پر غالب نہیں آسکتی ___ اور اس کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کس طرح اس امّت کے ہاں سے (عملاً) گم کر دیا گیا۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

ایرانیت کو ان عقائد سے کیا تعلق ہے؟

(۱) جو عقائد و نظریات سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ ائمۂ کرام کی طرف منسوب ہیں جو سب کے سب عرب تھے۔ پھر اس میں ایرانیت کا کیا دخل ہے۔ اور

(۲) یہ عقائد و نظریات، مسلمانوں کے ایک فرقہ (شیعہ حضرات) کے ہیں۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم (سنّی حضرات) کے تو یہ عقاید نہیں۔ کیا ان کے ہاں سے بھی قرآن گم ہوگیا اور اگر ایسا ہوا تو وہ کیسے؟

یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور غور و فکر سے سمجھنے کے قابل۔ آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کو بارِ دگر سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نہ سنّی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ میں قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں اور میرا عقیدہ (بلکہ ایمان) یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک و مشرب جو اس کے خلاف جاتا ہو، میرے نزدیک درست نہیں ہوسکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگانِ سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو، تو (ان حضرات کے احترام کے پیشِ نظر) میں یہی کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ میری اس وضاحت کے بعد آگے چلئے۔

گزشتہ صفحات میں جن عقائد و نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی نسبت بے شک شیعہ حضرات کے ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق مستند طور پر کہا جا سکے کہ وہ خود ان حضرات میں سے کسی کی تصنیف ہے۔ ان حضرات کی طرف منسوب کردہ اقوال، ہمارے پاس جامعینِ روایات کے ذریعے پہنچے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اثنا عشری جامعینِ احادیث میں ثقۃ الاسلام

جامعین حدیث سب ایرانی تھے

کلینی کو سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ سمجھا جاتا ہے، ان کی پیدائش مقامِ رَے (موجودہ طہران) میں ۲۵۰ھ میں ہوئی اور وفات ۳۲۹ھ میں۔ امامیہ شیعہ حضرات کے گیارہویں امام حسن عسکریؑ نے ۲۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کے بعد، ان کے بارہویں امام، محمد المنتظر، چار یا پانچ سال کی عمر میں (بغداد کے قریب) سامرا کے غار میں مستور ہوگئے۔ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کلینی

لہ ڈاکٹر زاہد علی (صہ ۱۵۵)

نے، اپنی جمع کردہ روایات، کسی امام سے براہِ راست نہیں لیں، دوسرے راویوں سے حاصل کی ہیں۔ شیعہ حضرات کی حدیث کی باقی تین کتابیں، اس سے بھی بعد میں مدون ہوئی تھیں۔ یعنی من لا یحضرہ الفقیہ (شیخ محمد ابن علی، متوفی ۳۸۱ھ) اور تہذیب اور استبصار (ابوجعفر محمد بن حسن، متوفی ۴۶۰ھ)۔ الکافی کے متعلق کتاب الشافی (جلد اول) کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ

الکافی کی ضعیف روایات

کافی کی سولہ ہزار ایک سو ننانوے احادیث میں صرف پانچ ہزار بہتر صحیح ہیں۔ باقی ایک سو چوالیس حسن، ایک ہزار ایک سو سولہ موثق تین سو دو قوی اور نو ہزار چار سو پچاس ضعیف ہیں۔ (ص ۶)

انہی (مولانا سید ظفر حسن صاحب) نے کتاب فروعِ کافی کے ترجمہ میں تحریر فرمایا ہے۔

فرقہ شیعہ نے اپنی کتابوں کے متعلق کبھی یہ دعوے نہیں کیا کہ من اولہ و آخرہ ان کی تمام احادیث صحیح اور متواتر ہی ہیں۔ کسی کتاب میں کسی حدیث کا پایا جانا اس کی صحت کا ثبوت نہیں کہا جا سکتا، جب تک وہ معیارِ حدیث پر صحیح نہ اُترے۔ (ص ۵)

اور راقم الحروف کے نزدیک "معیارِ حدیث" یہ ہے کہ کوئی حدیث جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہو، صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں سے جو عقاید اور تعلیم، قرآن کریم کے خلاف ہے، حضرات ائمہ کرام کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ ان کا شمار (سید ظفر حسن صاحب کی مندرجہ بالا تصریح کے مطابق) ضعیف روایات میں ہونا چاہیئے لیکن چونکہ شیعہ حضرات انھیں صحیح سمجھتے ہیں اس لئے مجھے اس باب میں کسی فیصلہ دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ ویسے بھی، مجھے اس سلسلہ میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ، شیعہ حضرات کی طرف سے، خود مجھے بھی، "فتنۂ انکارِ حدیث" سے متہم کیا گیا ہے۔ چنانچہ الشافی (جلد اول) کے مقدمہ میں، علامہ محمد حسن صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

مجھ پر انکارِ حدیث کا اتہام

مگر افسوس ہے کہ بایں ہمہ، مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ حدیث کی افادیت کا منکر ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے — ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولی — اس فتنہ کا حجرِ اساس تو پیغمبرؐ اسلام کے آخری لمحاتِ حیات میں آنجنابؐ کے مطالبۂ قلم و دوات کے جواب میں حسبنا کتاب اللہ (بخاری شریف .....) کہہ کر رکھ دیا گیا تھا اور انہی "حسبنا کتاب اللہ" کے قائل کے دورِ

خلافت میں بیان کرنے والوں کو درّے لگتے۔ (الفاروق، شبلی)۔ یہ نظریہ فاسدہ، اسلام کے مختلف ادوار سے گزر کر، مولوی چکڑالوی اور مسٹر پرویز کے وقت خوب برگ و بار لے آیا۔ اب جب کہ وہ اپنے اصلی رنگ و روپ اور حقیقی خدوخال کے ساتھ منظرِ عام پر ظاہر ہوا ہے تو حسبنا کتاب اللہ کے قائل بھی چلا اُٹھے ہیں اور اس خیال کے ابطال پر متعدد کتب و رسائل لکھ ڈالے ہیں مگر ان حضرات کو کون سمجھائے کہ ــــ اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست۔ (مقدمہ الشافی، جلد اوّل ص۳)

میرا "انکارِ حدیث" اتنا ہی ہے جو میں کہتا ہوں کہ جو حدیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے، رسولؐ اللہ یا بزرگانِ دین کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ وہ کوئی ایسی بات کہہ نہیں سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔ میں نے کبھی نہیں کہا ــــ ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ ــــ جو احادیث قرآن کے خلاف نہیں میں انھیں صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن حسبنا کتاب اللہ کہنے کے جرم میں مجھے جس ذاتِ گرامی (حضرت عمرؓ) کے ساتھ ہم رشتہ کیا گیا ہے، میرے لئے یہ سعادت کچھ کم باعثِ فخر نہیں۔

گرچہ خوردیم نسبت ایست بزرگ

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ سنّیوں کے عقاید و تصورات پر ایرانی سازش نے کیا اور کس طرح اثر کیا۔

سُنّیوں عقاید و مسلک پر عجمی اثرات

اسے پھر دہرا دیا جائے کہ عجمی سازش کا محوری نقطہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآنِ کریم کی اہمیّت و عظمت کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ خیال عام کیا گیا کہ رسولؐ اللہ نے قرآنِ مجید مرتّب شکل میں اُمّت کو نہیں دیا تھا، وہ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ جمع اور مرتّب کیسے ہوا، اس کے لئے عجیب و غریب روایات ملتی ہیں۔ (روایات کے متعلق ہم تفصیل سے بعد میں لکھیں گے) اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ اہلِ سنّت والجماعت یعنی سُنّی حضرات کے احادیث کے متعدد مجموعے ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو جنھیں صحاحِ ستّہ کہا جاتا ہے، مستند مانا جاتا ہے۔

جمعِ قرآن کے متعلق شکوک و شبہات

پھر صحاحِ ستّہ میں سے دو کتابوں، مسلم اور بخاری کو صحیحین اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کتبِ روایات میں جمعِ قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

امام ابنِ ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہُوا، ابو بکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابو بکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور یہ کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہوگئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا، بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرحِ صدر کر دیا تھا میرا بھی شرحِ صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہوگئی جو ان کی تھی۔ ابو بکرؓ مجھ سے کہنے لگے۔ تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہ صلعم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمھیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت لکھتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا، وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو شرحِ صدر ہُوا تھا مجھے بھی شرحِ صدر ہو گیا اور وہی میری رائے بھی ہوگئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم (آلایہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہؓ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا[1]۔

(مقامِ حدیث ص۲۷۶)

دیگر روایات میں ہے کہ (۱) قرآنِ مجید کو جمع حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ حضرت زیدؓ نے اس پر صرف نظرِ ثانی کی تھی۔ (۲) اسے حضرت عمرؓ نے جمع کیا تھا۔ (۳) حضرت عمرؓ نے بھی نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ نے

---

[1] تفصیل ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب — مقامِ حدیث — میں دیکھئے۔ وہیں ان تمام روایات کے حوالے بھی ملیں گے۔

جیسا کہ بابِ چہارم، "حسبنا کتاب اللہ" میں بیان کیا گیا ہے، ان روایات کی رُو سے، اس طرح جمع شدہ قرآنِ مجید میں بعض آیات درج ہونے سے رہ گئی تھیں اور تلاش کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انھیں حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی تھی۔ آیۂ رجم کے متعلق حضرت عمرؓ کو اصرار تھا کہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں قرآن میں موجود تھی۔ جب ان سے (ان کے زمانۂ خلافت میں) کہا گیا کہ اس آیت کو قرآن میں شامل کر دیا جائے تو آپ نے کہا کہ اسے قرآن میں تو درج نہیں کریں گے، البتہ حکم اس کا باقی رکھیں گے۔ چنانچہ عمل اس آیت کے مطابق ہوتا رہا۔ یعنی زنا کی سزا سنگساری۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے کے مرتّب کردہ صحائف، حضرت حفصہؓ کے پاس تھے۔ مروان نے انھیں اپنے زمانے میں ان سے لے کر جلا دیا۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ نسخہ کنوئیں میں گر گیا تھا)۔ بہرحال، وہ کنوئیں میں گر گیا ہو، یا جلا دیا گیا ہو، وہ نسخہ (یا صحائف) امّت کے پاس نہ رہے۔ جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے مرتب فرمایا تھا اس کے متعلق امام ابنِ ابی داؤد اپنی تصنیف کتاب المصاحف میں لکھتے ہیں کہ

> جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہو گئے اور انھوں نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر مجھے اس میں کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں۔ (لیکن کوئی بات نہیں) عرب انھیں اپنی زبانوں سے ٹھیک کر لیں گے۔

بعد میں (بزمانۂ بنی اُمیّہ) حجاج بن یوسف نے، مصحفِ حضرت عثمانؓ میں گیارہ جگہ تبدیلیاں کیں۔ مروّجہ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حجاج کا تصحیح کردہ ہے۔ علاوہ ازیں، خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مختلف صحابہؓ کے پاس جو قرآن کے نسخے تھے، ان میں اور مصحفِ عثمانؓ میں متعدد اختلافات تھے ــ یہ ہے جو خود سُنّیوں کی روایات میں قرآنِ کریم کے متعلق درج ہے۔

آپ سوچئے کہ جس قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق اس قسم کے خیالات عام کر دیئے جائیں، اس کی محکمیت کہاں باقی رہ سکتی ہے؟ (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ خیالات کس زمانے میں وضع اور عام کئے گئے اور ان میں ایرانیت کا کہاں تک دخل تھا)۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

بہرحال، قرآنِ مجید (روایات کی رُو سے جیسے تیسے بھی جمع ہوا) امّت کے پاس آ گیا۔ اب اس کے متعلق یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اس میں بے شمار آیات منسوخ ہیں۔ یعنی وہ آیات قرآن میں موجود ہیں، ان کی تلاوت بھی کی جاتی ہے لیکن حکم

ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات، قرآن ہی کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔ اور دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیات، بعض احادیث کی رُو سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ اس (دوسرے) عقیدہ کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر لکھیں گے۔ جہاں تک اوّل الذکر عقیدہ کا تعلق ہے، قرآن میں یہ کہیں درج نہیں کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اسے "علماء" پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس آیت کے متعلق چاہیے کہہ دیں کہ اسے فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ یہ روش اس قدر عام ہوئی کہ قرآنِ مجید کی قریب پان سو آیات منسوخ قرار دے دی گئیں۔ اس تعداد میں مختلف زمانوں میں کمی بیشی ہوتی رہی، تاآنکہ شاہ ولی اللہ نے انھیں گھٹا کر پانچ آیات تک محدود کر دیا۔ لیکن پانچ ہوں یا پانسو، یہ عقیدہ بہرحال موجود ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف پڑھی جاتی ہیں، ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے ___ اور منسوخ ہو چکا ہے (خدا کے فیصلے کی رو سے نہیں) کسی نہ کسی "عالم" کے فیصلے کی رُو سے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو قرآن (منسوخ ہونے سے) بچ گیا ہے، اسے سمجھا کس طرح جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایرانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "محدث" کے عقیدہ کی رُو سے کہا یہ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی وحی رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی اور دوسری قسم کی وحی ائمہ پر۔ ان کے صرف طریقِ تنزیل میں فرق تھا۔ وحی ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ یہ عقیدہ شیعہ حضرات کا تھا۔ سُنّیوں کے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ضرور ہیں لیکن یہ دونوں رسول اللہ پر ہی نازل ہوئی تھیں۔ ایک کو وحیِ جلی (یا وحیِ متلو) کہا جاتا ہے اور دوسری کو وحیِ خفی (یا وحیِ غیر متلو)۔ وحیِ جلی (یا متلو) قرآنِ مجید کے اندر درج ہے اور وحیِ خفی احادیث[ل] کے اندر۔ وحیِ غیر متلو کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی "مثلہٗ معہٗ" قرآن کے ساتھ اس کی مثل" ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن معدی کرب کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ

مثلہٗ معہٗ | رسول اللہ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ مجھے الکتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور (اِنّی اوتیت الکتاب و مثلہٗ معہٗ)۔ یاد رکھو۔

[ل] دو قسم کی وحی کا عقیدہ، یہودیوں کے ہاں رائج تھا۔ ایک شکتب (وحیِ متلو) اور دوسری شبعلفہ (وحیِ غیر متلو) ہمارے ہاں یہ عقیدہ وہیں سے آیا ہے۔

عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا، اپنے تخت پر بیٹھا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو۔ جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔

(ابو بکر خطیب بغدادی، کتاب الکفایہ)

یہ "مثلہٗ معہٗ" احادیث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو (مثلہٗ معہٗ) کا عقیدہ، امام شافعیؒ نے وضع کیا تھا۔ یہ عسقلان کے صوبہ میں، ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ہارون الرشید کے زمانہ میں یمن میں مقیم تھے جو شیعوں کا مرکز تھا۔ ان پر بھی تشیع کا الزام تھا اور اسی بنا پر ہارون الرشید کے ہاں ان کی طلبی بھی ہوئی تھی۔ اکثر عراق آتے جاتے تھے۔ آخر الامر، انھوں نے مصر میں، ۲۰۴ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ فقہ اسلامی، علامہ خضری مرحوم، صہ ۲۴۷)۔ بہر حال، اس عقیدہ کو کسی نے وضع کیا ہو، اس کی رُو سے، قرآن سے باہر، ایک مجموعۂ وحی اور وجود میں آگیا جنھیں احادیث کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں دین کا صحیح تصور اور دل میں قرآنِ مجید کے "لاشریک لہٗ" ہونے کی عظمت تھی، انھوں نے اس نئے عقیدہ کی مخالفت کی اور کہا کہ دین میں سند اور حجت صرف قرآنِ کریم ہے۔ جیسا کہ قدامت پرست طبقہ کا قاعدہ ہے، انھوں نے اُن لوگوں پر معتزلہ کا لیبل لگایا اور پھر ان کے خلاف اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ حالت یہ ہے کہ آج بھی جو شخص عقل و فکر کی بات کرے اور اس کے دلائل کا کوئی جواب اُن سے نہ بن پڑے، اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ معتزلہ ہے۔ وہ خود بخود ملحد و زندیق قرار پا جائے گا۔ "معتزلہ" اور شوافع کی کشمکش اور آویزش کی داستان بڑی طویل اور خونچکاں ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ آخر الامر ہوا یہ کہ امام شافعیؒ کا پیش کردہ نظریہ، اسلام کا بنیادی ستون قرار پا گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے حدیث کو کیا مقام حاصل ہو گیا۔ اسے غور سے سنئے۔ جمعیت اہلِ حدیث کے سابق صدر، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) اپنی کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں لکھتے ہیں۔

حدیث کا مقام

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا...... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمۂ سنّت کی تصریح کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور

ملّت سے خروج کے مرادف[1] ...... جبریل، قرآن اور سنّت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضورؐ کو سنّت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

یہاں تک تو قرآن اور حدیث کو ہم پایہ قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام اوزاعیؒ کا قول ہے،۔

قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں[2]۔

اور ایک دوسرے امامِ حدیث 'یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ قرآن حدیث پر قاضی نہیں ہے[3]۔

اتنا ہی نہیں، عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث، قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ " فتنۂ انکارِ حدیث " میں لکھتے ہیں کہ

نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حُجّت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجّت نہ رہے ...... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ن الوصیۃ للوالدین۔ (۲/۱۸۰) " تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے، اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔" رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لا

---

[1] شیعہ حضرات صرف ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں جو ان کے ائمہ سے مروی ہیں اس لئے ان کے نزدیک سنّیوں کی حدیثیں قابلِ قبول نہیں اور سُنّیوں کا مسلک یہ ہے کہ جس حدیث کا کوئی ایک راوی بھی شیعہ ہو وہ حدیث قابلِ تسلیم نہیں۔ اہلِ حدیث حضرات، بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار کو بھی مستلزمِ کفر قرار دیتے ہیں اور حنفی حضرات مسلم اور بخاری کی قریب دو سو احادیث سے انکار کرتے ہیں اور احادیث کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد' جامع امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چھ سات ہزار کو قبول کیا اور باقی سب کو مسترد کر دیا۔ اسی طرح دیگر جامعینِ احادیث نے بھی۔ [2] مختصر جامع بیان العلم ' [illegible]

[3] خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے (قریب سنہ [illegible]) میں، امام ابن شہاب زہریؒ نے ایک مختصر سا مجموعہ، خلیفہ کی فرمائش پر مرتب کیا تھا لیکن احادیث کے مروّجہ مجموعوں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

وصیۃ للوارث. وارث کے لئے وصیّت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اس حدیث پر رہا ہے، یعنی وارث کے لئے وصیّت ناجائز قرار دے دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف، حجّت اور موجبِ عمل رہا۔ (ص ۸۵)

یہ ہے وہ مقام جو قرآن کے مقابلہ میں احادیث کو عطا کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ یہ عقاید کب وضع ہوئے اور احادیث کب وجود میں آئیں! ہم باب چہارم (حسبنا کتاب اللہ) میں بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسولؐ اللہ نے مرتّب فرما کر اُمّت کو دیا، نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مرتب ہوا۔ انہوں نے، بلکہ، اس کی شدّت سے مخالفت کی۔ ان کے بعد صحابہؓ اور بنی امیّہ کے زمانے میں بھی ان کے مجموعے مرتّب نہ ہوئے۔ یہ مجموعے عباسیوں کے زمانے میں مرتّب ہوئے۔ (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے)۔

جامعینِ حدیث سب ایرانی تھے

اہلِ سنّت والجماعت، ان مجموعوں میں سے چھ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ (شیعہ جامعینِ روایات کی طرح) یہ سُنّی جامعینِ روایات بھی سب کے سب ایرانی تھے۔ یعنی

نام جامع حدیث	سنِ وفات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	ان میں سے کتنی اپنے مجموعہ میں درج کیں
۱۔ امام محمدؒ اسماعیل بخاریؒ	۲۵۶ھ یا ۲۶۰ھ	بخارا	چھ لاکھ	۲۷۶۲ (مکررات حذف کرنے کے بعد)
۲۔ امام مسلم بن حجاج	۲۶۱ھ	نیشاپور	تین لاکھ	۴۳۴۸
۳۔ امام ابو موسےٰ محمد ترمذیؒ	۲۷۹ھ	ترمذ	تین لاکھ	۳۱۱۵
۴۔ امام ابو داؤد	۲۷۵ھ	سیستان	پانچ لاکھ	۴۸۰۰
۵۔ ابو عبد اللہ ابنِ ماجہ	۲۷۳ھ	قزوین	چار لاکھ	۴۰۰۰
۶۔ امام عبد الرحمٰن نسائیؒ	۳۰۳ھ	صوبہ خراسان کا گاؤں نسا	دو لاکھ	۴۳۲۱

آپ غور فرمائیے کہ رسولؐ اللہ کی احادیث جمع کی جاتی ہیں اور ان جامعین میں سے کوئی بھی عرب نہیں۔ سب کے سب ایرانی ہیں۔ ان جامعین کے سامنے احادیث کا کوئی تحریری مواد نہیں تھا۔ تمام احادیث زبانی

روایات کی بنا پر جمع کی گئیں۔ آپ سوچئے کہ ایک شخص، رسول اللہ کی وفات کے قریب دو اڑھائی سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، لوگوں کی زبانی سُن کر، روایات جمع کرتا ہے۔ اسے، اس طرح (خود اس کے اپنے بیان کے مطابق) قریب چھ لاکھ روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے وہ، محض اپنے فیصلے سے، ستائیس اٹھائیس سو کے قریب قبول کر لیتا ہے اور باقیوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ جنہیں وہ قبول کر کے اپنی کتاب میں درج کر لیتا ہے، ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ "وہ قرآن کے ہم پایہ ہیں۔ قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ ان کا انکار کفر ہے۔" ان مجموعوں میں روایات کس قسم کی ہیں، ان کی مثالیں پیش کرنے کا یہ مقام نہیں[1]۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہو گا کہ یہ احادیث عباسیوں کے دور میں جمع ہوئیں۔ اس لئے ان میں اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ

عباسیوں کی محبت

حضورؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد سے محبت نہ رکھے[2]۔ (توجیہہ النظر، ص۱ ــــ نیز جامع البیان)

اس کا محرک جذبہ تو (ظاہر ہے) سیاسی ہے۔ عقیدہ کے طور پر اس قسم کی متعدد روایات ان کتابوں میں مذکور ہیں۔ جن میں کہا گیا ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگ، خدا کی نعمتوں کو مدِنظر رکھ کر خدا سے محبت کرو اور اللہ کی محبت کی وجہ سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبت رکھو۔

(ترمذی، بحوالہ تفسیر ابن کثیر، سورۃ شوریٰ)

یا مثلاً، قرآنِ مجید میں ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى۔ (۴۲/۲۳) "اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں (تبلیغِ قرآن) کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں طلب کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے رشتہ داری کا برتاؤ رکھو۔" حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ

---

[1] اس کے لئے ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ــ مقامِ حدیث ــ ملاحظہ فرمایئے۔

[2] تفسیر ابن کثیر میں بھی اس روایت کو نقل کیا گیا ہے۔ (پچیسواں پارہ، تفسیر سورۂ شوریٰ ص۱۱۳)

آنحضرتؐ کی قرابت جملہ بطونِ قریش میں تھی۔ اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغِ قرآن اور تعلیمِ دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذی نے اسے درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ:۔

اس آیت میں قربیٰ کے معنی آلِ محمدؐ" کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولادؑ[1] کے ساتھ محبت رکھو۔

دوسری طرف ان کتابوں میں اس قسم کی حدیثیں بھی ملتی ہیں۔

اصحاب معاذاللہ مرتد ہو گئے تھے

حضرت ابنِ عباسؓ راوی ہیں کہ رسولؐ خدا نے یہ خطبہ پڑھا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پیر ننگے بدن، بلا ختنہ اٹھائے جاؤ گے...... پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے اور فرشتے انہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ اس وقت میں کہوں گا، اے میرے رب! یہ میرے صحابیؓ ہیں۔ اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔ اس وقت میں بھی عیسٰیؑ کی طرح سے کہوں گا۔ (وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا۔ الآیۃ) پھر اللہ کی جانب سے ندا آئے گی کہ اے محمدؐ! یہ لوگ تیرے جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے[2]۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس سے پہلے قرآنِ کریم کی جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی انہی کتب روایات میں مذکور ہے اور صحابہ کبارؓ کے متعلق یہ روایت (کہ وہ، معاذاللہ، حضورؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے) بھی انہی کتابوں میں ہے۔ پھر سُن لیجئے کہ یہ کتابیں شیعوں کی نہیں، سنیوں کی ہیں اور ایسی مستند اور معتبر کہ (ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے) ان میں درج شدہ کسی ایک روایت کا انکار، مسلمان کو دائرۂ اسلام سے

---

[1] اس میں ہر سیّد شامل ہوگا۔

[2] اس سے پہلے شیعہ حضرات کی یہ روایت ہمارے سامنے آچکی ہے جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے وقت اہلِ بیت کے علاوہ صرف تین یا پانچ مسلمان رہ گئے تھے باقی مرتد ہو گئے تھے۔ وہ شیعوں کی روایت تھی یہ سنیوں کی ہے اور بخاری شریف کی ہے۔

خارج کر دیتا ہے۔

ان کتبِ احادیث نے جب یہ بنیاد فراہم کر دی تو اس پر اسلام کی ایک جدید عمارت کا استوار کر دیا

امام ابنِ جریر طبری

جانا کچھ مشکل نہ رہا۔ یہ کارنامہ، سُنّیوں کے ایک نہایت قابلِ اعتماد، جلیل القدر، امام[1]، محمد جریر ابنِ طبریؒ نے سر انجام دیا۔ علامہ تمنّا عمادی (مرحوم) ان کے متعلق رکھتے ہیں۔

> ابنِ جریر، طبرستان کے قصبہ اٰمل کے رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیلِ علم کے لئے باہر نکلے۔ ۴۴ برس تک تحصیلِ علم میں سرگرداں رہے۔ (شیعہ تھے لیکن ازروئے تقیہ سنّی بنے رہے۔ ان کے دادا کا اصل نام رستم تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابنِ جریر خالص شیعوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے[2]۔
>
> (طلوعِ اسلام، بابت اگست ۱۹۶۸ء صفحہ ۶۱)

امام طبریؒ نے ایک تو یہ کیا کہ (تیس جلدوں میں) قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے انداز یہ رکھا کہ ہر آیت کی تفسیر میں احادیث درج کر دیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تفسیر، امام طبری کی نہیں، بلکہ خود رسول اللہؐ کی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ اب قرآنِ کریم کا وہی مطلب صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جسے امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جب کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں آیت کی یہ تفسیر خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائی ہے تو کونسا مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکے گا کہ یہ تفسیر ٹھیک نہیں۔ یا یہ کہ اس آیت کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ نہ کوئی مسلمان ایسا کہنے کی جرأت کر سکے گا، نہ کوئی مسلمان ایسی بات سننا گوارا! نتیجہ یہ کہ قرآنِ کریم کا مفہوم، تفسیرِ طبری میں مقیّد ہو کر رہ گیا اور اس پر غور و تدبّر اور تنقید و تنقیح کے سب دروازے بند ہو گئے۔ چنانچہ، طبری کے

---

[1] شیعہ حضرات کے ہاں امامؑ کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن سنّی حضرات، علومِ دین کے ماہرین کو امام کہہ کر پکارتے ہیں (مثلاً، امام بخاری، امام طبری، امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ)

[2] شیعہ حضرات انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہ ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

بعد جس قدر تفاسیر لکھی گئیں وہ انہی کے تتبّع میں لکھی گئیں اور جس نے اس سے اختلاف کی جرأت کی، وہ منکرِ حدیث، منکرِ رسالت، فلہذا ملحد و بے دین قرار پا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اقدام سے، قرآنِ مجید کو کس طرح ان عقاید و تصوّرات کا پابند بنا دیا گیا جو ان کتبِ روایات میں مذکور تھے جنہیں ایرانی جامعین نے جمع اور مرتّب کیا تھا۔

جو اسلام عہدِ رسالت مآبؐ و صحابہؓ میں عملاً رائج و نافذ تھا، اس کے سامنے آنے کی ایک شکل یہ ہو سکتی تھی کہ اُس دَور کی صحیح تاریخ مرتب ہو جاتی۔ امام طبری نے یہ راستہ بھی روک دیا۔ انہوں نے اپنی

امام طبری کی تاریخ

تفسیر کے ساتھ ایک ضخیم تاریخ بھی مرتّب کر دی جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہی سُنّی مسلمانوں کے ہاں سب سے مبسوط تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے طبری کی تفسیر کو اُمّ التفاسیر اور ان کی تاریخ کو اُمّ التاریخ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی کتبِ تاریخ بعد میں مرتب ہوئیں، ان کا ماخذ طبری کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں انہوں نے یہ التزام کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کا جو مفہوم اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کی تائید میں عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ کے واقعات اپنی تاریخ میں درج کر دیئے ہیں اور اس عہد کے جو واقعات اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں، ان کی تائید میں، اپنی تفسیر میں روایات درج کر دی ہیں۔ اس طرح تفسیرِ طبری اور تاریخِ طبری، عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ کے اسلام کی مستند تعبیر کی آئینہ دار قرار پا گئیں اور یہی اسلام آگے چلا۔

(۰)

ماورائے قرآن، خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کے عقیدہ کا نتیجہ اتنا ہی نہیں تھا کہ اس سے

اسلام دین نہ رہا، مذہب بن گیا

وضعی حدیثیں وجود میں آگئیں اور انہوں نے دین کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلام سرے سے دین ہی نہ رہا۔ یہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے، اسے ہم تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ دین، اپنی آزاد مملکت میں زندگی کا عملی نظام بن سکتا ہے۔ "اپنی آزاد مملکت" سے مراد ہے وہ مملکت جس میں قوانینِ خداوندی (قرآنِ کریم کے احکام، اصول و اقدار) حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ اور عمل پیرا ہوں۔ اگر ایسی مملکت نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا، وہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مذہب میں، دین کے ارکان رسمی شکل میں باقی رہ جاتے

ہیں جن کا عملی نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ادائیگی سے انسان، بزعمِ خویش یہ سمجھ کر کہ میں احکامِ خداوندی کی اطاعت کر رہا ہوں، اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلا لیتا ہے اور بس۔

استخلاف فی الارض (اپنی آزاد مملکت) کے سلسلہ میں قرآنِ کریم میں جو متعدد آیات آئی ہیں، ان میں سرِفہرست سورۂ نور کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور عملِ صالح کریں گے، خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں حکومت عطا کرے گا اسی طرح جیسے اس نے انہی جیسے لوگوں کو ادوارِ سابقہ میں حکومت عطا کی تھی۔

آیۂ استخلاف کا مفہوم بدل گیا

یہ حکومت اس لئے عطا ہو گی کہ اس کے ذریعے، خدا اس دین کو متمکن کر دے جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور تاکہ ان کا خوف، امن سے بدل جائے اور اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ جو لوگ اس کے بعد اس ابدی صداقت سے انکار کریں گے، وہ فاسق ہوں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور اسی سے دین کا تمکن ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنی حکومت کے بغیر دین کا تمکن ممکن نہیں۔

لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ "امامت" کے لئے حکومت (استخلاف فی الارض) لازمی شرط نہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت علیؓ کے سوا، دیگر ائمہ میں سے کوئی بھی صاحبِ حکومت نہ تھا۔ اس مشکل کے حل کے لئے کہا گیا کہ مذکورہ بالا آیت میں استخلاف سے مراد دنیاوی حکومت نہیں بلکہ "روحانی امامت" ہے۔ اصولِ کافی میں ہے۔

امام ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا اور اس

میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وصی کو پیدا کیا اور اس کی مشیت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہوا اور اس میں آنے والے سال کے جُملہ امور تفصیل سے بتا دیئے جائیں جو اس سے انکار کرے گا اس نے علم الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیاء و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں لوگوں پر حُجّت اس چیز سے جو ان تک پہنچتی ہے۔ اس رات میں یہ امور جبریل ان کے پاس لاتے ہیں۔ میں نے کہا، کیا محدث وغیرہ کے پاس بھی جبریل آتے ہیں اور دیگر ملائکہ۔ فرمایا انبیاء و مرسلینؑ کے بارہ میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ ان کے علاوہ بھی دنیا کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک خدا کی کوئی حجّت روئے زمین پر ضرور رہے گی اور ہر شبِ قدر میں امرِالٰہی نازل ہو گا' اس شخص پر جس کو خدا اپنے بندوں میں سب سے زیادہ دوست رکھتا ہے۔

خدا کی قسم شبِ قدر میں ملائکہ اور روح امرالٰہی کو لے کر آدم پر نازل ہوئے اور خدا کی قسم جب آدم مرے تو اُن کے وصی ان کی جگہ ہوئے۔ اسی طرح آدم کے بعد جو انبیاء بھی آئے تو شبِ قدر میں ان کے پاس امرِالٰہی آیا اور ان کے بعد ان کے اوصیاء کے پاس۔

اور خدا کی قسم آدم سے لے کر محمدؐ مصطفےٰ تک اس رات میں جس کے پاس بھی امرِالٰہی آیا، اس کو حکم دیا گیا کہ وہ فلاں شخص کو وصیت کرے۔ خدا نے اپنی کتاب میں آنحضرتؐ کے بعد والیانِ امر کے متعلق فرمایا ہے " تم میں جو لوگ ایمان دار ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں' خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو روئے زمین کا خلیفہ اسی طرح بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو بنایا ہے الیٰ قولہ وہی لوگ فاسق ہیں۔ یعنی خدا فرماتا ہے، میں تم کو تمہارے نبی کے بعد اسی طرح خلیفہ بناؤں گا اپنے علم و دین اور عبادت کے لئے جس طرح اوصیائے آدم کو بنایا تھا۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کے بعد ختم المرسلین کو مبعوث کیا (تاکہ) میرے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ فرمایا، میری عبادت کریں ایمان کے ساتھ۔ محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ پس جو لوگ اس کے خلاف کہیں گے وہ فاسق ہیں۔ پس خدا نے آنحضرت صلعم کے بعد والیانِ امر کو علم پر قدرت دی اور وہ ہم ہیں۔ (الشافی، جلد اول ۲۸۵-۲۸۴)

یہی نہیں، الکافی کی دوسری روایات میں، طلب و ہوسِ سلطنت و حکومت (ریاست) کو ہلاکت قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمانوں کے دین میں ہوسِ ریاست اس سے زیادہ خوفناک اور مضر ہے جتنی دو شکاری بھیڑیوں کی موجودگی بکریوں کے گلّے کے لئے جو اپنے چرواہے سے الگ ہو گیا ہو۔ (الشافی جلد دوم، صہ ۳۱۶)

ایک اور روایت میں ہے۔

حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ہوسِ ریاست و حکومت کی وہ ہلاک ہو گیا۔ (ایضاً)

اس سے "دنیاوی حکومت" اور "روحانی مملکت" نہ صرف دو الگ الگ چیزیں قرار پا گئیں، بلکہ دنیاوی حکومت، مبغوض و مردود ٹھہرا دی گئی۔ مذہب اور سیاست کی یہ ثنویّت، نظریۂ امامت کے تعلق سے شیعوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ سنّیوں کے ہاں بھی اسی طرح راہ پا گئی۔ موروثی امامت کے عقیدہ کے زیرِ اثر، بادشاہت پہلے ہی موروثی ہو چکی تھی (چنانچہ صدرِ اوّل کے بعد مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئیں، خواہ وہ شیعوں کی تھیں خواہ سنّیوں کی، سب موروثی تھیں) مذہب و سیاست

مذہب و سیاست میں ثنویت

کی ثنویّت کے نظریہ کے ماتحت، امورِ مملکت اور امورِ شریعت بھی دو الگ الگ شعبوں میں بٹ گئے۔ امورِ مملکت بادشاہوں کے حصّے میں آ گئے اور امورِ شریعت، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں ___ شخصی قوانین (PERSONEL LAWS) اور ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق بھی اسی ثنویّت کا نتیجہ ہے۔ یوں خود ایک مملکت بھی دو حصّوں میں منقسم ہو گئی جن میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ایک بادشاہ کی، دوسری مذہبی پیشواؤں کی۔

اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ حکومت دو حصّوں میں بٹ گئی، اس سے قانون سازی کا وہ سارا طریق ہی الٹ گیا جو قرآن کا تجویز کردہ اور دین کی اساس تھا۔ قرآنی نظامِ سیاست کی رُو سے، قانون سازی کا اصول یہ تھا کہ اُمّت، باہمی مشاورت سے، احکام و اصولِ قرآنی کے حدود میں رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین وضع کرتی تھی۔ قرآنی حدود غیر متبدّل رہتی تھیں اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ مشاورت کا نظام، بادشاہت نے ختم کر دیا اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والے قوانین کا تصوّر، مذہبی پیشوائیت نے ناجائز قرار دے دیا۔

امام شافعیؒ کے پیش کردہ مسلکِ حدیث کی رُو سے عقیدہ یہ قرار پاگیا کہ احکام و قوانین سب کے سب احادیث کے اندر موجود ہیں۔ یہ مکمل بھی ہیں اور غیر متبدّل بھی۔ اس لئے نہ کسی نئے قانون کے

قانون سازی کا امکان ختم کردیا

وضع کرنے کی ضرورت ہے، نہ موجودہ احکام میں ردّ و بدل کی اجازت۔ یہ اہلحدیث کا مسلک تھا۔ اہلِ فقہ نے شروع شروع میں اس مسلک کی مخالفت کی اور کہا کہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں، قیاس (اجتہاد) کی رُو سے، نئے نئے احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں اور جس حکم پر اجماع[1] ہوجائے، وہ اُمّت کے لئے قانون بن جائے گا ___ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں، یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع، اس کی سند یہی فقہی مسلک ہے۔ اس سے بہرحال، نئے نئے احکام وضع کرنے کا امکان موجود رہا، لیکن بعد میں انہوں نے بھی یہ عقیدہ اختیار کرلیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے نہ سابقہ فقہی فیصلوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور نہ ہی نئے احکام وضع کئے جاسکتے ہیں[2]۔ اہلحدیث کا عقیدہ یہ تھا کہ جب قرآن اور حدیث میں تضاد پایا جائے تو حدیث کا حکم برقرار رہے گا کیونکہ حدیث، قرآن پر قاضی بھی ہے اور اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔ یہی عقیدہ اہلِ فقہ نے بھی اختیار کرلیا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس مسلک کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ۔
> اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے[3]۔

یعنی، اگر قرآن کے کسی حکم اور فقہ کے کسی فیصلہ میں اختلاف نظر آئے، تو پہلے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ قرآنی آیت کی اس طرح تاویل کی جائے کہ اس کا مفہوم فقہ کے مطابق ہوجائے اور اگر ایسا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اہلحدیث چونکہ کسی حدیث کو (جو ان کے ہاں صحیح قرار دی گئی ہو) منسوخ نہیں تسلیم کرتے اس لئے، اس نکتہ پر اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں باہمی بحث و نزاع ہوتی

---

[1] اجماع کے متعلق آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ اس سے کن لوگوں کا اجماع مقصود ہے۔

[2] فقہ کے چار مسالک معروف ہیں۔ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی۔

[3] تاریخ فقہ اسلامی، مؤلفہ علامہ خضری (مرحوم)، ص ۴۲۱۔

ہے۔ جہاں تک قرآنی احکام کے منسوخ ہو جانے کا تعلق ہے، اس میں دونوں متفق ہوتے ہیں۔

اِس وقت اُمّت، انہی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ___ یعنی شیعہ اور سُنّی۔ پھر سنّیوں میں اہلحدیث اور اہلِ فقہ اور اہلِ فقہ میں حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی۔ ان سب کے ہاں دین میں سند اور حجّت روایات ہیں اور یا ائمہ فقہ کے فیصلے۔ قرآن صرف تلاوت کے لئے باقی رہ گیا ہے اور یا اس لئے ___ کہ از یٰسین اُو آسان بمیری[1]۔

انسانوں کے وضع کردہ تصوّرات نے، انسانوں پر جن انسانیّت سوز لعنتوں کو مسلّط کیا، تفصیل میں جایئے تو ان کی فہرست طویل طویل ہے لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں سمٹایا جا سکتا ہے ___ (۱) ملوکیّت۔ (۲) مذہبی پیشوائیت اور (۳) نظامِ سرمایہ داری۔ قرآن کریم نے ان تینوں لعنتوں کو ختم کر کے، انسان کو کس طرح صحیح آزادی سے ہمکنار کیا، اس کی جھلک ہم، اس کتاب کے گذشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں۔ عجمی سازش نے، قرآن کو نگاہوں سے اوجھل کر کے، ان لعنتوں کو کس طرح پھر سے زندہ کر کے انہیں عین اسلام بنا دیا، اس کا اجمالی تذکرہ زیرِ نظر باب میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ ان میں سے پہلی دو لعنتوں کا احیاء کس انداز سے کیا گیا، اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔

نظامِ سرمایہ داری کا احیاء

اس نے نظامِ سرمایہ داری کو کس طرح دوبارہ زندہ کر کے، اسلام کا جزو بنا دیا، یہ داستان بھی بڑی دلخراش ہے اور ایک جداگانہ تصنیف کی محتاج[2]۔ ہم سردست صرف اس اصولی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بجائے، روایات کو دین میں سند قرار دیدینے کے بعد ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) یہ روایات عہدِ عباسیہ میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں، جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا، اسے اسلامی قرار دینے کے لئے

---

[1] ہمارے زمانے میں (مولوی) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) نے قرآنِ خالص کی طرف دعوت دی لیکن چونکہ ان کے سامنے بھی اسلام بہ حیثیّت ایک مذہب کے تھا، دین کی حیثیت سے نہ تھا، اس لئے ان کے متبعین بھی ایک فرقہ (اہلِ قرآن) بن کر رہ گئے اور یوں قرآنی تصوّرِ اسلام کے لئے اور زیادہ نقصان کا موجب بن گئے۔

[2] میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

روایات وضع کی گئیں جن میں سے کچھ کتبِ احادیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتبِ تاریخ میں۔ انہی روایات پر مبنی فقہ مرتّب کی گئی۔ لہذا، نظامِ سرمایہ داری، حدیث اور فقہ دونوں کی رُو سے، عین اسلام بنا دیا گیا۔ اس کی ایک بیّن مثال ہم اس سے پہلے سابقہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک بار پھر سامنے لے آنا، قارئین کے ذوقِ سلیم پر ناگوار نہیں گزرے گا۔

قرآنِ کریم میں نظامِ سرمایہ داری کے خلاف بے شمار آیات آئی ہیں۔ ان میں دو بیّن آیات سورۂ توبہ کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے فی سبیل اللہ (انسانیّت کی فلاح و بہبود کے لئے قوانینِ خداوندی کے ماتحت) خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، (اے رسولؐ!) تو ان کے لئے خدا کی طرف سے الم انگیز عذاب کا اعلان کر دے۔ (یہ عذاب اس دن وارد ہو گا جب) اس مال و دولت کو جہنّم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور کمر کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ اب تم اس کا مزہ چکھو۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ واضح حکم، سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اب دیکھئے کہ حدیث کی رُو سے اس آیت کی تفسیر کیا کی گئی ہے۔ ابوداؤد میں ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں

ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُنکر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الزکوٰۃ)

یعنی، اس تفسیر کی رُو سے، جسے ارشادِ رسالت مآبؐ کہہ کر پیش کیا گیا، قرآنِ کریم کی اس آیت کا مطلب یہ ہوگیا کہ اگر سال بھر کے بعد اڑھائی فیصد زکوٰۃ دے دی جائے تو پھر جس قدر جی چاہے دولت جمع کی جا سکتی ہے۔ اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مالِ تجارت کے کارواں کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا اونٹ مصر میں۔ اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع، فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جن کی رُو سے مال و دولت اور جائیداد اور زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کی ہی نہیں جا سکتی۔ ان (فقہی) احکام کی تفصیل میں جانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ (ہمارے زمانہ میں) سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ان کا ملخص اپنی کتاب "مسئلۂ ملکیّتِ زمین" میں ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیّت پر بھی، مقدار اور کمیّت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیّت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلاحد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیّت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اسکے حقوقِ ملکیّت کو مقدار کے لحاظ سے مقیّد کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک خاص حد سے زاید ملکیّت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔ (۱۹۵۰ء ایڈیشن صہ ۵۲)

یہ ہے وہ اسلام جسے فقہ، احادیث اور تاریخ کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کیخلاف لب کشائی کرے اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ تم اسلام کو بہتر سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ اور سلف صالحینؒ بہتر سمجھتے تھے!

آپ نے دیکھا کہ عجمی سازش نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

(٭)

اس وقت تک ہم نے اپنی گفتگو کو احکام تک محدود رکھا ہے، لیکن بنیادی بات عقائد کی ہوتی ہے۔

عقائد میں تبدیلی

اس لئے کہ عقیدہ ہی وہ اساس ہے جس پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ فرد اور قوم دونوں کی زندگی کی۔ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔ (۸/۵۳) خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہ کرے، تو اس سے مقصود یہی تھا۔ انسانوں میں نفسیاتی تبدیلی، عقائد کی رو سے پیدا ہوتی ہے اور عربوں نے (اسلام کے صدرِ اوّل میں) جو محیّر انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ قرآن کے عطا کردہ عقاید (نظریات و تصوّراتِ حیات) کی بدولت تھا۔ مجم اس حقیقت سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے قرآنی عقاید کو اس طرح بدل دیا کہ اب ڈھونڈے سے بھی ان کا نشان نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرینگے۔

قرآن کا عطا کردہ بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور قومیں اپنی تقدیر آپ بناتی ہیں۔ مکافاتِ عمل کا یہی وہ عقیدہ تھا جس پر ایمان رکھنے سے جماعتِ مومنین چند سال کے عرصہ میں نہ صرف قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی وارث بن گئی بلکہ ان کی صدیوں پرانی تہذیب کو مٹا کر (یا دھندلا کر) انسانیت کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔ ایرانی اور بازنطینی (عیسائی) دونوں انسان کو مجبور قرار دیتے تھے۔ اس عقیدہ کو ماننے والی قومیں، عربوں (مسلمانوں) کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی تھیں جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ ایران کی پہلی ضرب کا نشانہ یہی عقیدہ تھا۔

مجوسیت کا بنیادی عقیدہ تقدیر کا تھا۔ ان کے ہاں "نوشتۂ تقدیر" اٹل فیصلہ تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا تھا۔ یہ عقیدہ، قرآنی عقیدہ کی ضد تھا۔

تقدیر کا عقیدہ

ایرانیوں نے اپنے اسی عقیدہ کو مسلمانوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے جس شخص نے اس مسئلہ کو چھیڑا، وہ معبد بن خالد جہنی ہے۔ اس نے اس مسئلہ کو ابو یونس نامی ایک دانشور سے اخذ کیا تھا جس کا تعلق اساورہ سے تھا (اساورہ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ شاہنشاہِ ایران کے دانشوروں پر مشتمل جیش تھا جو مسلمان ہو کر کوفہ، بصرہ وغیرہ میں پھیل گیا تھا)۔ معبد سے اس عقیدہ کو غیلانِ دمشقی نے لیا اور آگے پھیلایا۔ اس عقیدہ کا ملخص یہ تھا کہ انسان اپنے مقدّرات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، بے بس اور مجبور ہے۔

بعض مورّخین کا خیال ہے کہ عقیدۂ جبر کا بانی جعد بن درہم تھا۔ ابن الندیم کی تحقیق کی رُو سے، یہ شخص ایرانی الاصل، مانوی مذہب کا پیرو تھا جو ظاہرداری میں مسلمان ہوگیا تھا۔ درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان نے سیکھا جو خراسانی الاصل تھا اور اس نے اسے مسلمانوں میں عام کیا۔ شیعہ اور سنی کی تفریق کے بعد مسلمانوں میں جو پہلا فرقہ پیدا ہوا، وہ یہی جبریہ (یا قدریہ) تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ، قرآن کے عقیدۂ مکافاتِ عمل کی نقیض تھا۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایسا عقیدہ جو قرآن کے ایک بنیادی عقیدہ کے یکسر خلاف تھا، مسلمانوں میں کس طرح راہ پا گیا۔ گزشتہ صفحات میں جو بحث سامنے آچکی ہے اس

تقدیر کے متعلق روایات

کی روشنی میں اس (بظاہر مشکل ترین) سوال کا جواب نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ اس عقیدہ کی تائید میں احادیث وضع کر دی گئیں۔ اس کے بعد اس کے "عین اسلام" قرار پا جانے میں کچھ مشکل ہی نہ رہی۔ اس سلسلہ میں دو چار احادیث ملاحظہ فرمائیے۔ جنہیں ہم (احادیث کے معتبر مجموعہ) مشکوٰۃ، باب التقدیر سے پیش کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خدا تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خدا نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے، یہاں تک کہ ناوانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصّہ لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری، مسلم) نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی آدم کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی اور فرمایا، پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدمؑ

---

[1] مسئلۂ تقدیر سے متعلق میری مستقل تصنیف 'کتاب التقدیر' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی اور پھر فرمایا کہ ۔ پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسول اللہ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ رسول اللہ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالےٰ جب کسی بندے کو جنّت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنّتیوں ہی کے کام کراتا ہے....... اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنّت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے...... اور خدا اس کو اس کے کاموں کے سبب دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ مالک، ترمذی، ابو داؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپؐ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنّتیوں کے نام ہیں۔ اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے اُلٹے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جا سکتا ہے نہ کم۔ (بحوالہ ترمذی)

(۵) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ خداوند تعالےٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے، یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدّت (عمر)، اس کا نیک و بد عمل، اس کے رہنے کی جگہ، اس کی واپسی اور رزق۔

(بحوالہ احمد)

ظاہر ہے کہ جو شخص قرآنِ کریم کی واضح تعلیم اور علم و بصیرت کی روشنی میں اس قسم کی روایات پر غور کرے گا، اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات ابھریں گے اور وہ ان کا اطمینان بخش جواب چاہے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے اس صورتِ حال کا بھی پہلے سے حل سوچ لیا تھا! اس کے لئے انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں جن سے اس بحث کا دروازہ ہی کھلنے نہ پائے۔ (مثلاً) حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے

تھے کہ رسولِ خدا تشریف لائے اور ہماری باتیں سن کر ان کا چہرہ انار کے دانوں کی طرح سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے انتہائی غصہ کے عالم میں فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تم میں اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں جب انہوں نے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی تو انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ سو میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور مکرر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ پر بحث مت کرنا۔ (بحوالہ ترمذی) یعنی ان لوگوں نے عقیدۂ جبر کو مسلمانوں میں عام کر دیا اور اس پر بحث و نظر کے دروازے بند کر دیئے۔ برامکہ نے اس عقیدہ کو بڑے زور و شور سے پھیلایا۔ مجوسیوں کا عقیدہ تھا کہ آنے والے سال کے تمام واقعات اور لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ نوروز کی شب میں ہو جاتا ہے۔ برامکہ نے اسی شبِ نوروز کو "مسلمان کر کے" اس کا نام شبِ برأت (مقدرات کی رات) رکھ دیا۔ شبِ برات کی آتشبازی مجوسی آتشکدوں کے شعلوں سے ٹوٹتے ہوئے شراروں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شیعہ حضرات "شبِ قدر" کو قسمتوں کے فیصلے کی رات مانتے ہیں۔ الکافی میں ہے۔

> امام ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا اور اس میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وصیؑ کو پیدا کیا اور اس کی مشیت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہو اور اس میں آنے والے سال کے جملہ امور تفصیل سے بتا دیئے جائیں۔ جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیاء و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں۔ لوگوں پر حجت اس چیز سے جو ان تک پہنچتی ہے۔ اس رات میں یہ امور جبریلؑ ان کے پاس لاتے ہیں۔ (الشافی، جلد اول، صہ ۵-۲۸۴)

اس روایت میں یہ ٹکڑا کہ "جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی"۔ بات کو آگے بڑھاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایمان کے پانچ اجزاء ہیں۔ اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت (۴/۱۳۶، ۲/۱۷۷)۔ سارے قرآن میں انہی اجزاء کا ذکر ہے۔ انہی کے اقرار سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے انہی کے انکار سے کافر۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب ایمان کے پانچ اجزاء نہیں، چھ ہیں اور چھٹا جزو یہی عقیدۂ تقدیر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

> اٰمنت باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ و البعث بعد الموت۔

میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی، خیر اور شر سب خدا کی طرف سے مقدّر ہو چکے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزاء خدا نے مقرر کئے تھے، ان میں ایک کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا۔ اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ اور یہ اضافہ حسبِ معمول روایات کی رُو سے کیا گیا۔ مثلاً

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر ایمان نہ رکھے۔ (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت کو حق جاننے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ ماننے اور (۴) تقدیر پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ)

یوں تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان بن گیا — یعنی یہ عقیدہ کہ نفع، نقصان، رنج و راحت، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی، عزّت و ذلّت، نیکی و بدی (اور افراد سے آگے بڑھ کر قوموں کا) عروج و زوال، ان کی موت و حیات، فتح و شکست، محکومی اور حکمرانی، سب خدا کی طرف سے پہلے سے مقدّر ہے۔ انسان کی سعی و کاوش اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی — وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے — آپ اسبابِ زوالِ امت کی تحقیق و تفتیش کے لئے بڑی بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔ اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کمیٹیاں بٹھاتے اور کمیشن متعیّن کرتے ہیں لیکن اس کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ تفتیش کی حاجت۔ قوموں کو تباہ کرنے کے لئے، ایک "عقیدۂ تقدیر" کافی ہے۔ عجمی سازش نے اس عقیدہ کو امّتِ مُسلمہ میں عام کر کے — بلکہ اسے اس کا جزوِ ایمان بنا کر — اس ہمہ تن شعلہ جوالہ قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا[1] اور اس کی نگاہ کا زاویہ اس طرح بدل دیا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہے کہ یہ چھٹا جزوِ ایمان، قرآن پر اضافہ اور اس کی بنیادی تعلیم کے یکسر خلاف ہے، تو قوم اس کے لئے صلیبیں کھڑی کر دیتی ہے۔ سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کے جزوِ ایمان بن جانے کے بعد، یہ قوم قیامت تک بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے؟ — تقدیر کا ایک مفہوم وہ تھا جسے حضرت عمرؓ نے سمجھایا تھا[1] اور ایک مفہوم وہ ہے جسے عجمی سازش نے وضع

---

[1] دیکھئے چوتھا باب۔

کیا۔ فاروقی مفہوم (جو قرآن کے عین مطابق تھا) کفر قرار پا گیا اور عجمی مفہوم، مسلمانوں کا جزوِ ایمان ___ مزہ آیا نہ انتقام لینے کا!!

لیکن نہیں!! ابھی اس ترکش کا آخری تیر باقی ہے ـ یہ تیر نہیں، وہ سیلِ سُبک سیر وزمیں گیر ہے، جس کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس سازش کی یہ غارت گرِ متاعِ دین و دانش چال، اسلام کے تابوت کی آخری میخ تھی۔

تصوّف

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ختمِ نبوّت کی مہر کو توڑنے اور وحی کے مقابلے میں اس کا ہم پایہ ایک نیا دروازہ کھولنے کے لئے محدثیّت کا نظریّہ وجود میں لایا گیا لیکن یہ خصوصیّت اہلِ تشیع کے ائمہ کرام تک محدود رہی۔ اس لئے اس کا اثر و نفوذ بھی انہی کے دائرے میں مقیّد۔ سنّیوں کے ہاں اس کے مقابل، دو قسم کی وحی کا نظریّہ اختراع کیا گیا اور قرآن سے خارج عقاید و احکام کو قرآن کا ہم پایہ قرار دے دیا گیا لیکن یہ چیز نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تک محدود رہی اور اس کا ما حصل احادیث کے سرمایہ میں مقیّد۔ ضرورت اس امر کی محسوس کی گئی کہ خدا کے ہاں سے "براہِ راست علم پا لینے" کے اس امکان کو قیامت تک ممتد کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو تصوّف نے آ کر پورا کر دیا، وہ تصوّف جس کے متعلق علاّمہ اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:۔

> اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (اقبالؒ نامہ، جلد اوّل ص۵۷)

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، کوفے کا رہنے والا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا جس کی وفات ۱۶۰ھ کے قریب رملہ کی خانقاہ میں ہوئی۔ تصوّف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان، خاص قسم کے مجاہدات، ریاضات، مراقبات اور چلّہ کشیوں کے ذریعے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے، جہاں وہ خدا سے براہِ راست مکالمہ اور مخاطبہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات اس عقیدے کے حامی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اس قسم کے مخاطبہ اور مکالمہ کو اپنے ائمہ منصوص میں محدود سمجھتے اور وہی خیال کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے صوفیائی کی مخالفت کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صوفیائے کے تمام خانوادے (نقشبندیہ کے سوا) انہی

ائمہ کی وساطت سے حضرت علیؓ تک پہنچتے ہیں، جنہیں متفقہ طور پر شاہِ ولایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا درجہ خلافت سے بہت بلند ہے۔ اتنا ہی نہیں، صوفیاء کے نزدیک، تصوّف کے بلند ترین مقام پر صرف اہلِ بیت پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ ابنِ عربی، "فتوحاتِ مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ قطب الاولیا ہمیشہ اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ دیگر صوفیا، جو ان سے متفق نہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ قطب الاقطاب بہرحال اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ (تحقیقِ سیّد و سادات، محمود احمد عباسی ص ۲۱۹)

اہلِ تشیع کے ہاں محدثیت کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سرچشمۂ علمِ خداوندی سے رسولؐ اللہ کو وحی ملتی تھی،

شیخ اکبر ابن عربی

اسی سے ائمہ کرامؒ کو علم حاصل ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی عقیدہ اہلِ تصوّف کا ہے۔ سرخیلِ صوفیاء، محی الدین ابنِ عربیؒ، جنہیں شیخِ اکبر کہا جاتا ہے، اپنی مشہور کتاب، فصوص الحکم، میں لکھتے ہیں:۔

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا، اولیاء ان کے متعلق رسولؐ خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔ ...... اگرچہ رسولؐ اللہ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسولؐ پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مُصرّح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالےٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ کشف و الہام اور مادۂ وحی رسول ایک ہے...... صاحبِ کشف اللہ تعالےٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین کے موافق ہے...... ان کا اللہ تعالےٰ سے لینا عین رسولؐ اللہ کا لینا ہے...... یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معیّن طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ

آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے .... پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ وہ معدنِ خاتم النّبییّن و مادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لئے تھے .... خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔ اگرچہ خلیفۂ ولی ظاہر میں متبعِ نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔

(سلیم کے نام، جلد سوم، صفحہ ۴۴ - ۴۲)

محقّقین کا خیال ہے کہ ابنِ عربی، اخوان الصّفا کے نظریّات و معتقدات سے متاثر تھے، اخوان الصفا باطنی مسلک اسماعیلیہ کے پیرو، مصنّفین کا ایک گروہ تھا جس نے (اپنے ناموں کا انکشاف کئے بغیر) کچھ رسائل تصنیف کئے تھے۔ ان کی تعلیمات، محمد ابوالقاسم الاندلسی (متوفی ۳۹۵ھ) کی تصانیف کے توسّط سے افریقہ اور اندلس (ہسپانیہ) تک رائج ہو گئی تھیں اس لئے ان محقّقین کا قوی گمان ہے کہ ابن عربی انہی کے فلسفہ سے متاثر تھے۔ تصوّف کی جو تصویر ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک حد تک اخوان الصّفا کی تعلیمات کا عکس ہے۔[1]

صوفیا اپنے اس علم کا نام کشف اور الہام رکھتے ہیں۔ لفظ مذہب کی طرح یہ الفاظ بھی ان معنوں میں قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آئے۔ نہ ہی اس میں تصوّف یا صوفی کا لفظ کہیں آیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ

تصوّف کے اساسات قرآن کی ضد ہیں

وحی اور کشف و الہام میں صرف لفظی فرق ہے، مفہوم و معانی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا۔ اس منفرد اور خصوصی علم کی رُو سے صوفیاء کرام نے جن عقاید و نظریات کو پیش کیا، وہ اسلام کی ضد ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) مجوسیت کا بنیادی تصوّر، اہرمن اور یزداں کی ثنویّت تھا، یعنی خیر اور شر کی مسلسل جنگ۔ صوفیاء نے کہا کہ انسانی ذات روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ مادہ سراسر شر ہے اور روحِ خداوندی (خواہ وہ کُل ہو یا اس کا جزو) خیر۔ اب دنیا میں مادہ اور روح

---

[1] مذہب اور باطنی تعلیم، مرزا محمد سعید مرحوم۔

کی کشمکش جاری ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات، مادہ کی کثیف دلدل سے نکل کر پھر سے اپنی اصل میں جا کر جذب ہو جائے۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھنا ہے۔ چنانچہ ترکِ علائق، ترکِ لذات، یعنی دنیا اور مافیہا کو قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دور بھاگنا، تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط ہے۔ قرآنِ کریم نے مادی کائنات کے متعلق کہا تھا کہ اسے خدا نے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ آپ سوچئے کہ قرآن کے اس تصور کے مقابلے میں یہ نظریہ کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اور اس سے دور بھاگنا ہی مقصدِ حیات، کس طرح اسلام کو اُس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا اور اس کی حامل قوم کو مفلوج و مصلوب بنا کر رکھ دیتا ہے۔

(۲) قرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے، لیکن (افلاطون کے نظریۂ اعیانِ نامشہود کے تتبع میں) تصوف کا نظریہ یہ ہے کہ اس مادی کائنات کا کوئی وجود نہیں، وجود صرف خدا کا ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ سب خدا ہی خدا ہے۔ اسے نظریۂ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ حضرات کہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں، اُس کا اندازہ شیخِ اکبر کے اس بیان سے لگائیے جسے انہوں نے 'فصوص الحکم' میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

> پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کیونکہ وہ ذاتِ حق سے جدا نہ تھا، اگرچہ اُس کی صورت فرعون کی تھی ۔۔۔ (معاذ اللہ)

(۳) صوفیاء کا دعوٰی ہے کہ اُن کے اِن تمام عقائد اور نظریات کا مدار قرآنِ کریم پر ہے۔ اس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے وہ معنی جو اُس کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں، ظاہر بینوں کے لئے ہیں، اس کے حقیقی معنی، اُس کے باطن میں پوشیدہ ہیں اور یہ باطنی علم صرف صوفیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ اس علمِ باطن کی رُو سے وہ قرآنی آیات کو کس طرح مسخ کرتے ہیں، اس کا اندازہ، ابنِ عربی ہی کی بیان کردہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى - (۲۰/۵۵) اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔" ابنِ عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> ہم سب احدیت سے نکلے تھے، فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ پھر

نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

باطنی علم کی سند علم باطنی کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اسے عوام پر ظاہر نہیں کیا جاتا خواص تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اس کی سند کے لئے اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں کہ

حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک (علم ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے لیکن اگر میں دوسرے (علم باطنی) کو ظاہر کر دوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی جائے۔

(بخاری باب العلم، نیز مشکوٰۃ باب العلم)

(جیسا کہ حوالہ میں لکھا گیا ہے) یہ حدیث بخاری میں موجود ہے جسے اصح الکتب کہا جاتا ہے کس قدر مقام تاسف ہے کہ نہ امام بخاری کو اس کا خیال آیا اور نہ ہی ایسی حدیثوں کی نسبت نبی اکرمؐ کی طرف کرنے والوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس سے حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس پر کتنا بڑا حرف آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کو علم (وحی) عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ یَآيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ۔ اے ہمارے پیغمبر! جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے' اسے لوگوں تک پہنچا دے۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ۔ (۵/۶۷) اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا۔ دوسری طرف کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ۔ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ (۲/۱۵۹) "جو لوگ اس روشن علم اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جسے ہم نے نوعِ انسان کے لئے قرآن میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے' ان پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی بھی لعنت۔" اللہ تعالےٰ کے ان احکام اور وعید کے بعد یہ کہنا کہ خدا نے حضورؐ کو جو علم دیا تھا' آپؐ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ کو تو ظاہر کر دیا تھا

معاذ اللہ! اور دوسرے حصہ کو (معاذ اللہ) مخفی طور پر خواص میں سے بعض کے سپرد کر دیا' اس تاکید کے ساتھ کہ وہ بھی اسے عوام پر ظاہر نہ کریں' خواص تک محدود رکھیں' حضورؐ کی ذاتِ اطہر کے خلاف ایسا سنگین الزام ہے جس کے تصور سے روح کانپتی ہے لیکن ہمارے اربابِ شریعت اسے حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں درج کرتے ہیں اور اصحابِ طریقت اسے' اپنے "علم باطنی" کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں — ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے! یہ "علم باطنی" کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ صوفیہ میں سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ اسے علم لدنی کہا جاتا ہے۔ اس علم کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ

علمِ لدُنّی | مرید اسے اپنے مرشد سے بالمشافہ حاصل کرے۔ یہ صدیوں کے بُعدِ زمانی کے باوجود، باطنی طریق سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً) حضرت جنیدؒ بغدادی کے متعلق (کہ جن کی وفات ۲۹۸ھ میں ہوئی تھی) یہ معتقیدہ ہے کہ انہوں نے خرقۂ تصوف، رسولؐ اللہ کے صحابی، حضرت انسؓ بن مالک سے حاصل کیا تھا۔ اہلِ تصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ باطنی علم، رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ کو عطا فرمایا تھا اور آپ (حضرت علیؓ) سے یہ آگے، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا گیا۔ اس منتقل ہو کر آنے والے علمِ باطنی کے علاوہ، اولیاء کرام کو مزید باطنی علم، خدا سے براہ راست بھی حاصل ہوتا ہے جس کی رُو سے ان پر قرآن کے باطنی معانی منکشف ہوتے ہیں۔

باطنی معانی کی رُو سے قرآنِ کریم کو کس طرح مسخ کیا جاتا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریقِ تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبالؒ نامہ، جلد ۱، صہ ۳۵)

اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا۔

> جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبالؒ نامہ، جلد ۱، صہ ۴۴)

(۴) دین، انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے ایک مکمّل نظام اور ضابطہ کا نام ہے جو اپنی مملکت میں متشکل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا اسلام الا بالجماعۃ۔ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا لیکن تصوف، جماعتی زندگی سے دور بھاگتا ہے۔ وہ اپنی اپنی خلوت گاہوں میں مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے انفرادی نجات کا قائل ہے۔ اس تصور کی رُو سے اسلام میں اور ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت

اور ایرانیوں کی مجوسیّت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

(۵) اسلام نے زندگی کو جہدِ مسلسل سے تعبیر کیا تھا اور اس جہد کی آخری شکل وہ بتائی تھی جہاں جماعت مومنین ظلم کی مدافعت کے لئے میدان جنگ میں اُتر آتی ہے۔ وہاں سے فاتح و منصور لوٹتی ہے تو غازی کہلاتی ہے اور جان دینے والے حیاتِ جاوداں کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اسلام میں، اس جہاد سے افضل کوئی عمل نہیں لیکن تصوّف اس جہاد کو جہادِ اصغر قرار دیتا ہے اور ترکِ دنیا کے ذریعے نفس کُشی کو جہادِ اکبر۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ وہ جہاد بالسیف کو بنہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کے ہاں کی ایک مشہور رباعی ہے۔

جہاد کے خلاف

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست | غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تراز وست
در روزِ قیامت ایں بادے کے ماند | ایں کشتۂ دشمن است آں کشتۂ دوست

علّامہ اقبالؒ اس رباعی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس نے اس کو زہر دیا ہے اُس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات دیا گیا ہے۔ آہ۔ مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔" (مکتوبِ اقبال بنام سراج دین پال، اقبال نامہ، جلد اول، صہ ۳۶)

اس ایک رباعی پر ہی کیا موقوف ہے۔ وہ (علّامہ اقبالؒ) لکھتے ہیں کہ:

تصوّف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی، اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہوجائے جیساکہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو پھر اُس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہوجاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اسی ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کے تنازع للبقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (ایضاً صہ ۴۴)

انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا:

ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام اور اس کے

نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ (اقبال نامہ، جلد ۱، صہ ۲۴)

اسے وہ مسلمانوں کا "مجوسی ورثہ" کہہ کر پکارتے ہیں، اور بصد کرب و اذیت لکھتے ہیں کہ:۔

اس مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کردیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیت اور اسلام)

علامہ اقبالؒ اور تصوف

علامہ اقبالؒ نے ۱۹۱۷ء میں (ISLAM AN MYSLICISM) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو لکھنؤ کے اخبار (NEW ERA) کی ۲۸، جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے تصوف کو "شعبدہ بازوں" کی کمند کہہ کر پکارا تھا۔[1]

صوفیا کی کتابوں میں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے، اس کی تبیین کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کی مثالیں میں نے اپنی کتاب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں پیش کی ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے دیکھ لیں۔

(۵)

مرزا غلام احمد کا دعویٰ

اب آگے بڑھیے۔ جب تصوف کے اس عقیدہ نے (جس کی بنیاد محدثیت کے نظریہ پر تھی اور جس کی ابتدا شیعوں کے ہاں سے ہوئی تھی) کشف و الہام کے دروازے کھول دیئے تو اس سے دعویٰ نبوت کا بھی امکان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی انہی سیڑھیوں سے مقامِ نبوت تک پہنچنے کے دعویدار ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلے لکھا۔

ہمارے سید الرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعد آنحضرتؐ کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس لئے شریعت میں نبی کے قائمقام محدث رکھے گئے ہیں۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] یہ مضمون طلوعِ اسلام، بابت اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔

ہیں نے لوگوں سے سوائے اس کے جو میں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، اور کچھ نہیں کہا کہ میں مُحدَّث ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اُسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح محدّثین سے۔ (حمامۃ البشریٰ ص۹۶)

سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی روشنی میں اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دِقّت نہیں رہتی کہ مرزا صاحب نے محدثیت کا تصوّر کہاں سے مستعار لیا تھا؟ اس کا سرچشمہ شیعہ اور تصوّف کا لٹریچر ہے۔ (مثال کے طور پر) ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ محدّث کا عقیدہ سب سے پہلے اہلِ تشیع کے ہاں آیا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ قرآنِ مجید کی آیت (۲۲/۵۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ....) میں، نَبِیٌّ کے بعد لفظ مُحَدَّثٌ تھا جو قرآن کے مروّجہ نسخوں میں نہیں ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اپنے دعویٰ محدثیت کی سند میں یہی آیت لفظ محدّث کے اضافہ کے ساتھ درج کی ہے۔ باقی رہا تصوّف، سو اس سلسلہ میں، مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان، پیغامِ صلح کی اشاعت بابت ۱۱ر جولائی ۱۹۷۳ء میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ،

> آپ کی (مرزا صاحب کی) تحریرات میں جو اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن سے اپنوں اور بیگانوں کو ٹھوکر لگی ہے اور آپ کو مدعیِ نبوّت سمجھنے لگے ہیں، جیسے ظلّی نبی، بروزی نبی، امتی نبی، غیر تشریعی نبی، فنا فی الرسول اور مجازی نبی، تو ان کے متعلق سمجھنے والی بات صرف یہ ہے کہ یہ اصطلاحات کہاں سے لی گئی ہیں اور ان کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنِ مجید اور احادیث میں تو کوئی ذکر نہیں اور آنحضرتؐ کے پانچ چھ سو سال بعد تک ہمیں ان کا وجود نظر نہیں آتا لیکن جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاحات صوفیائے کرام نے وضع کی ہیں۔

یہ ہیں ان کے دعوے کے منابع۔ اس کے بعد جو الہامات انہیں (بقول اُن کے) خدا کی طرف سے ملے، ان کے متعلق انہوں نے کہا۔

> میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُن الہامات پر اُسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام......

لہ براہینِ احمدیہ، ربوہ ایڈیشن (۱۹۵۷ء) ص۶۳۳، بحوالہ ہفتہ وار ایشیا، لاہور، مورخہ (۱۴) اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ میرے سامنے اس وقت براہینِ احمدیہ نہیں اس لئے میں نے اس حوالہ پر اکتفا کیا ہے۔

جانتا ہوں، اُسی طرح اُس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے، خدا کا کلام یقین کرتا ہوں۔ (حقیقۃ الوحی ص ۲۱۱)

اور ان کے بیٹے اور خلیفۂ اول، میاں محمود احمد نے کہا:۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی نبی آجائے تو پہلے نبی کا علم بھی اُسی کے ذریعے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا اور ہر بعد میں آنے والا نبی پہلے کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعہ دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں، سوائے اُس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا اور کوئی حدیث نہیں سوائے اُس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے۔

(اخبار الفضل، قادیان مورخہ ۱۵ ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون سی خصوصیتِ کبریٰ تھی جس کی بنا پر خدا نے مرزا صاحب کو اس منصب کے لئے منتخب کیا تھا! سُن لیجئے۔

اللہ تعالےٰ نے اس آخری صداقت کو قادیان کے ویرانوں میں نمودار کیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو فارسی النسل ہیں، اس اہم کام کے لئے منتخب فرمایا[1]۔ (اخبار الفضل، مورخہ ۳ ر فروری ۱۹۳۵ء)

آپ نے دیکھا کہ اس نبوت کے ڈانڈے کہاں جا کر مل رہے ہیں؟ — اِس فارسی النسل "مامور من اللہ" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قرآن کے حکمِ جہاد کو منسوخ قرار دے دیا۔

جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالےٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کیے جاتے تھے پھر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لئے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔

(اربعین نمبر ۴، ص ۱۵، حاشیہ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کیساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر

---

[1] یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ بھی سرزمینِ ایران ہی سے اٹھے اور ان کی "نبوت" کا کارنامہ بھی حکمِ جہاد کی تنسیخ تھا۔

پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیحِ موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا۔ ایضاً (ص ۲۸) (قادیانی مذہب، ص ۲۹۷)

یہ ہے اجمالی سا تعارف اس سازش کا جس کی رُو سے، ایران نے اپنی شکست کا انتقام عربوں ہی سے نہیں بلکہ نفسِ اسلام سے اس انداز سے لیا کہ اس کی اصل و بنیاد تک کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اس ساری بحث کو علامہ اقبالؒ نے ایک فقرہ میں سمٹا دیا ہے جس میں کہا ہے کہ :۔

ایرانی سازش کا ملخص

تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ (مقالہ نیو ایرا، ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء)

یہی "ایرانی اسلام" (یعنی ہمارا "مجوسی ورثہ") ہے جو صدیوں سے مروّج چلا آرہا ہے۔ اس میں شیعہ کی تخصیص ہے نہ سنّی کی۔ نہ اہلِ حدیث کی نہ اہلِ فقہ کی، نہ اربابِ شریعت کی، نہ اصحابِ طریقت کی سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمدن، تصوّف، شریعت، کلام بُتانِ عجم کے پُجاری تمام

اور اس کا نتیجہ یہ کہ :

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمّت روایات میں کھو گئی (اقبالؒ)

پھر، اس سازش کی ساحری کا کمال یہ ہے کہ ہمارے اربابِ مذہب، اصولات و جزئیات تک میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں، ان میں مسلسل باہمی آویزش و کشمکش رہتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتاویٰ تک صادر کرتے رہتے ہیں لیکن جو شخص ان سے یہ کہدے کہ :۔

زقرآن پیشِ خود آئینہ آویز دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

یہ سب کے سب، متحدہ و متفقہ طور پر اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔

علاج اس کا؟

سوال یہ ہے کہ کیا عجم کی اس سازش کا توڑ ممکن ہے اور اسلام کو اس ملبہ کے نیچے سے نکالا جا سکتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن:

بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے، وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی میری بھی عمر بھر کی آرزو اور پکار ہے اور ان کے مظاہر کی تازہ کڑی، میری یہ سعی و کاوش جو اس تصنیف کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ بایں دعا کہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

پرویز